سفر مقدّر ہے

(غـــــــــزلیـــــــں)

احمد کمالؔ حشمی

© روشن آراء

کتاب : **سفر مقدّر ہے**
موضوع : شاعری
شاعر : احمد کمال حشمی
پتہ : ۱/۲۸/ایچ، بی ایل نمبر۲، نیابازار، کانکی نارہ (مغربی بنگال)
طبع اوّل : جون ۲۰۰۵ء
تعداد : ۵۰۰
ضخامت : ۱۴۴صفحات
قیمت : ۱۲۵/روپے
کمپوزنگ: **شھلا گرافکس**، نیابازار، کانکی نارہ (مغربی بنگال)
سرورق : جاوید نہال حشمی
طباعت : آفسیٹ آرٹ پرنٹرس، ۳۷/ایلیٹ روڈ، کولکاتا-۱۶
ناشر : **اثبات ونفی پبلی کیشنز**، ۵/۸۹/رپن اسٹریٹ، کولکاتا-۱۶

- گلستاں پبلی کیشنز، ۱۶/زکریا اسٹریٹ، کولکاتا-۷۳
- مژگاں پبلی کیشنز، احمد ولا، ۸۵/رجے، توپسیا روڈ، کولکاتا-۳۹
- عثمانیہ بک ڈپو، ۱۲۵/رابندر سرانی، کولکاتا-۷۳
- تنویر بک ڈپو، ۱۱۲/رجی ٹی روڈ، آسنسول-۱

Safar Muqaddar Hai (Ghazals)
by
Ahmad Kamal Hashami
First Edition: June 2005 Price: Rs. 125/-
Publishers: Isbat-o-Nafi Publications
89/5, Ripon Street, Kolkata - 700016

انتساب

والد جناب **حشم الرّمضان**

اور

والدہ محترمہ **صالحہ بانو**

کے نام ــــــ

میری
زندگی
کی
ہر کامیابی
جنکی
دعاؤں
اور
شفقتوں
کی
مرہون
منّت
ہے!!

ے

بوڑھے ماں باپ کی خدمت میں لگا رہتا ہوں
میرا کعبہ بھی ہے گھر میں میرا طیبہ گھر میں

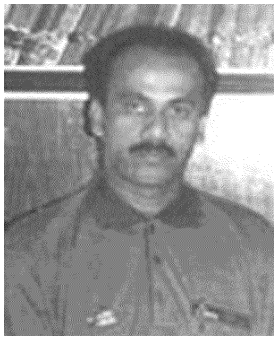

خاندانی نام : **احمد کمال حشمی**

قلمی نام : **احمد کمالؔ حشمی**

پیدائش : ۲۴/اگست ۱۹۶۴ء

آبائی وطن : بلیا (یو۔پی)

تعلیم : بی۔ایس۔سی

ملازمت : ریونیو آفیسر، شعبۂ ارضی واصلاحات ارضی
(حکومت مغربی بنگال)

آغازِ شاعری : ۱۹۸۷ء

کتابیں : (۱) **آیاتِ سخن** (کلکتہ کے مضافات کی شاعری کا انتخاب) ۱۹۹۵ء

(۲) **سفر مقدّر ہے** (غزلیات) ۲۰۰۵ء

زیرِ ترتیب : **چاند، ستارے، جگنو، پھول** (بچّوں کے لئے نظمیں)
سنگِ بنیاد (تضمینیں)

پتہ : ۱/۲۸/ایچ، بی ایل نمبر۲، نیا بازار، کانکی نارہ (مغربی بنگال)

فون نمبر : رہائش : (033)32939588

موبائل : (0)9433145485

فہرس

ایک خط ۱۰
احمد کمال حشمی کی غزل میں تازہ کار انسلاکات ۱۴
پختہ شعور کی غزل ۲۲

غزلیں

۱ اہلِ خرد کو پاگل کردے یا اللہ ۲۸
۲ تقلید میں کبھی نہ کسی کی، غزل کہی ۲۹
۳ اس سے ملا تو مل کے ادھوری غزل کہی ۳۰
۴ بیتے دنوں نے جب بھی پکارا غزل کہی ۳۱
۵ عجیب طرح کا موسم رہا ہے آنکھوں میں ۳۲
۶ سفر میں آتے ہیں مجھ کو نظر در و دیوار ۳۳
۷ نہ اُس کی یاد جاتی ہے نہ اُس کا غم نکلتا ہے ۳۴
۸ بے قرار میں بھی ہوں بے قرار دروازے ۳۵
۹ لوگ کتابیں، ناول اور رسالے پڑھتے ہیں ۳۶
۱۰ یوں چکھّو تو پھیکا پانی ۳۷
۱۱ سحر تا شام میں پھرتا رہا اُٹھا کر آگ ۳۹
۱۲ سیم مٹّی کی ہے زر مٹّی کا ہے ۴۰
۱۳ دیا میں جلاتا ہوں آ وَ ہواؤ ۴۱
۱۴ جسے ہم آنکھ کہتے ہیں بہت گہرا سمندر ہے ۴۲
۱۵ دشمنی بھی ہو تو اِک معیار ہونا چاہئے ۴۳
۱۶ آئینے کے جیسا میں ہوں میرے جیسا آئینہ ۴۴
۱۷ نگاہِ یار میں اچھا، بُرا ہونے سے پہلے تھا ۴۶
۱۸ ہمیشہ میرا سپنا ٹوٹتا ہے ۴۷
۱۹ سدا جھوٹے کو کوّا کاٹتا ہے ۴۸
۲۰ دھوکے سے کربلا میں بُلایا گیا مجھے ۴۹
۲۱ ایک گوشے میں پڑا رہتا ہے بوڑھا گھر میں ۵۰
۲۲ جو تیز دوڑتے تھے بہت جلد تھک گئے ۵۱

۲۳	گھٹا ہے نہ کوئی شجر، لوٹ جاؤ	۵۲
۲۴	ٹوٹے اِک خواب تو آنکھیں نہیں پھوڑا کرتے	۵۳
۲۵	گا کر مشاعروں میں سنانا تو ہے نہیں	۵۴
۲۶	میں ادھورا ہوں ابھی تک کبھی پورا ہو جاؤں	۵۵
۲۷	پُر تعفّن ہے فضا، چلئے یہاں سے چلئے	۵۶
۲۸	''آپ لاکھوں کی طرف میں ہوں بہتّر کی طرف''	۵۷
۲۹	مانا گھٹا نہ پیڑ کا سایہ سفر میں ہے	۵۸
۳۰	منزل نہ کوئی راہ نما گھر سے چل پڑے	۵۹
۳۱	زمانے بھر میں ہیں یوں تو ہمارے صد دشمن	۶۰
۳۲	زندگی میں دھمال ہے ہی نہیں	۶۱
۳۳	ہو عداوت مری زمانے سے	۶۲
۳۴	جگنوؤں اور ستاروں کی ہو تمثیل کوئی	۶۳
۳۵	وہ مجھے اِک خوبصورت کاغذی گھر دے گیا	۶۴
۳۶	غموں سے چور ہوتا جا رہا ہوں	۶۵
۳۷	بدلتی ہے ہوا، گرگٹ بھی رنگ اپنا بدلتا ہے	۶۶
۳۸	ہر سو اک سنّاٹا ہے، خاموش رہو	۶۷
۳۹	میں اُس کو یاد نہ آؤں یہ خیر ممکن ہے	۶۸
۴۰	غزل کہی تو وہی پردۂ سخن میں رہے	۶۹
۴۱	جب رکھّا میرے دوست نے خنجر خرید کر	۷۰
۴۲	ذہن و دل پر نشّہ چھایا جاتا ہے	۷۱
۴۳	شاخوں پر جب پھول اور پتّے اُگ آئے	۷۲
۴۴	میں کھلا دل کا دریچہ نہیں رہنے دیتا	۷۳
۴۵	ہر ایک سمت ہر ایک گام جا بجا روشن	۷۴
۴۶	راہ میں خار ہو یا کھائی بھلی لگتی ہے	۷۵
۴۷	کرا اہتمام تو جگنو زمیں میں بونے کا	۷۶
۴۸	گل کھلے چاند بھی نکلا کئی جگنو آئے	۷۷
۴۹	یار سارے اور رشتے دار سب	۷۸
۵۰	اِس کے گھر اُس کے گھر چراغ جلے	۷۹
۵۱	روشن ہے جو چراغ وہی کام کا چراغ	۸۰
۵۲	چراغ غم کا جلے یا جلے خوشی کا دیا	۸۱

۵۳	تنہائی میں چھت دروازے باتیں کرتے ہیں	۸۲
۵۴	کبھی تو آفتاب ہے دنیا	۸۳
۵۵	برسوں سے جستجو ہے تری کب ملے گا تو	۸۴
۵۶	زخم زخم پھولوں کی سُرخیاں نہیں جاتیں	۸۵
۵۷	خلافِ موجِ رواں تیرتی ہوئی مچھلی	۸۶
۵۸	سیر کرتے ہیں جو دریا کے کنارے آ کر	۸۷
۵۹	گھنے جنگل میں رہتی تھی لڑکی	۸۸
۶۰	لمحہ تمہاری یاد کا ٹالا کسی طرح	۸۹
۶۱	امیرِ شہر ہے زر کے نشے میں چور بہت	۹۰
۶۲	دیکھئے تو زندگی ہے ہر طرف	۹۱
۶۳	آدمی کے قریب اور پاس آدمی	۹۲
۶۴	ثواب وزہد کا بھی ایک پیمانہ ضروری ہے	۹۳
۶۵	چڑھاوے قیمتی سب آج کے بھگوان لیتے ہیں	۹۴
۶۶	ہے اُس میں حُسن ذرا کم ادا زیادہ ہے	۹۵
۶۷	سچ ہے کہ مجھ کو اُس سے محبت نہیں رہی	۹۶
۶۸	میں سنگ ہوں کہ گہر ہوں چلے پتا مجھ کو	۹۷
۶۹	ان سے اگرچہ پیش دلائل نہ ہو سکے	۹۸
۷۰	سلامت کوئی بھی نہ ڈالی رہی	۹۹
۷۱	کبھی دل میں ٹیسیں اُٹھائے خموشی	۱۰۰
۷۲	آلامِ زندگی کا مزہ ہم سے پوچھئے	۱۰۱
۷۳	کسی کو یاد میں ہر صبح و شام کرتا ہوں	۱۰۲
۷۴	جب ستم گر کا ستم ڈھانے کو جی چاہے گا	۱۰۳
۷۵	گھر میں رہنا ہے مسافر نہیں ہونا ہے مجھے	۱۰۴
۷۶	حالِ دل مختصر کہا جائے	۱۰۵
۷۷	ضرورتوں سے زیادہ بہت کماتا ہوں	۱۰۶
۷۸	بہہ گیا گھر تو نہیں اس میں خطا بارش کی	۱۰۷
۷۹	دَر پر دیا جلا کے سرِ شام رکھ دیا	۱۰۸
۸۰	بِک رہی ہے ہر اِک دکان میں دھوپ	۱۰۹
۸۱	خیال مجھ کو یہ آیا ہے ایک ٹھوکر سے	۱۱۰
۸۲	یہ سچ ہے اے زمیں کہ نہیں آسمان میں	۱۱۱

۸۳	زباں سے تو نے صدا دی ہے بار بار مجھے	۱۱۲
۸۴	کوئی بھی بات میری کب الگ ہے	۱۱۳
۸۵	وہ بڑھ گئے، تھی نظر جن کی رہ گزر کی طرف	۱۱۴
۸۶	ریگ زاروں میں نہیں آب تو کیا کیجے گا	۱۱۵
۸۷	اِک خطا زندگی، التجا زندگی	۱۱۶
۸۸	دن کو ہماری بنتی نہیں شیخ جی کے ساتھ	۱۱۷
۸۹	چاہے قلم ہوں ہاتھ، کٹے سر، غزل کہو	۱۱۸
۹۰	محبت میں کوئی خط مختصر اچھا نہیں لگتا	۱۱۹
۹۱	اُدھر حسرت سے تکتے ہیں مکانوں کو سفر والے	۱۲۰
۹۲	دیواروں پہ چھت ڈھال کے گھر ڈھونڈ رہے ہیں	۱۲۱
۹۳	دریچہ ہے نہ کوئی در، بڑا عجیب سا ہے	۱۲۲
۹۴	دِوانہ جن کو ہیں کہتے عجیب ہوتے ہیں	۱۲۳
۹۵	وہ ستم ڈھانے کے انداز بدل سکتا ہے	۱۲۴
۹۶	اپنی باتوں کو مختصر رکھو	۱۲۵
۹۷	تمام رات رہا تھا میں بے قرار سا کچھ	۱۲۶
۹۸	خونِ انساں کی ارزانی، دیکھ جمورے دیکھ	۱۲۷
۹۹	دیکھتی ہے آنکھ سب کچھ اور زباں چُپ چاپ ہے	۱۲۸
۱۰۰	تو رکھ دے ہاتھ مرے ہاتھ پر، ضروری ہے	۱۲۹
۱۰۱	اپنے اجداد کی املاک بچا کر رکھئے	۱۳۰
۱۰۲	سر وہ ہمارا قلم کرتے ہیں	۱۳۱
۱۰۳	نیلے، پیلے، کالے پتھر	۱۳۲
۱۰۴	ڈرتا ہے باہر کا سانپ	۱۳۳
۱۰۵	کوئی یہ دل کو بتا رہا ہے	۱۳۴
۱۰۶	دیکھو ایسا مت سمجھو	۱۳۵
۱۰۷	سب اُس کے محکوم رہے ہیں	۱۳۶
۱۰۸	دریا ہوں میں ساکت مجھے رہنا نہیں آتا	۱۳۷
۱۰۹	تاریخ شاید اُس کو نہیں یاد دیکھئے	۱۳۸
۱۱۰	جب بھی آئے تنہائی	۱۳۹
۱۱۱	سامنے آئینہ ہے اور میں ہوں	۱۴۰
۱۱۲	متفرق اشعار	۱۴۱ تا ۱۴۴

ایک خط

محترم قارئین!

''سفر مقدّر رہے'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ میرے اٹھارہ سالہ مشقِ سخن کا نتیجہ ہے۔ اس میں صرف غزلیں شامل ہیں کیوں کہ غزل ہی میری پسندیدہ صنفِ سخن ہے حالانکہ میں نے منھ کا ذائقہ بدلنے کے لئے آزاد اور ہائیکو نظمیں بھی کہی ہیں اور دوستوں کی فرمائش پر ماہیئے بھی لکھے ہیں۔ وقتاً فوقتاً دوسری اصناف پر بھی طبع آزمائی کی ہے مگر بنیادی طور پر میں غزل کا شاعر ہوں۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں ایک علمی اور ادبی گھرانے میں پیدا ہوا۔ ادبی ذوق مجھے ورثے میں ملا ہے۔ میرے والد جناب حشم الرّمضان کا شمار مغربی بنگال کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ ''میری نظمیں میرے گیت'' کے نام سے ان کا مجموعہ کلام شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو درسی کتابوں کے علاوہ میرے ہاتھوں میں کھلونا، نور اور پیام تعلیم جیسے بچّوں کے رسالے دیئے گئے۔ جب کچھ بڑا ہوا تو ابّا جان کی کتابوں کی الماری کھنگالنے کی عادت پڑ گئی جس میں شاعر، شب خون، کتاب اور شاخسار جیسے سنجیدہ اور معیاری ادبی رسالے نظر آئے۔ میں نے انہیں ذوق وشوق سے پڑھنا شروع کیا۔ ان میں شائع ہونے والی تخلیقات اس وقت میری سمجھ میں کم ہی آتی تھیں مگر پھر بھی ان کے مطالعے سے ایک لطف ملتا تھا۔ اس زمانے میں خاتون مشرق (نئی دہلی) اور فلم ویکلی (کلکتہ) مبتدیوں کے مقبول ترین جریدے تھے۔ یہ جریدے مجھے بھی پسند آتے تھے۔ پڑھتے پڑھتے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ مئی ۱۹۸۱ء میں میری پہلی کہانی ''شکار'' فلم ویکلی میں شائع ہوئی۔ اس طرح میری ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نویسی سے ہوا۔ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۹ء تک میں نے کل ۲۵ چھوٹی بڑی کہانیاں لکھیں جو سب کی سب مختلف رسالوں میں شائع بھی ہوئیں۔ مگر افسانہ نگاری میری طبیعت کو مطمئن نہ کر سکی کیوں کہ میری کہانیوں کا انداز بیانیہ تھا جب کہ زمانہ علامتی افسانوں کا تھا۔ اس لئے کچھ شاعر دوستوں کی صحبت اور اصرار نے میری طبیعت کو شاعری کی طرف مائل کر دیا۔ یوں تو میں نے پہلی غزل ۱۹۸۷ء میں کہی اور اس کے بعد وقفے وقفے سے یہ عمل جاری رہا مگر پوری سنجیدگی اور توجّہ کے ساتھ باقاعدہ طور پر غزل کہنے کا سلسلہ میں نے ۱۹۸۹ء میں شروع کیا، اور اب ۲۰۰۵ء میں اپنا شعری مجموعہ چھپوانے کی جسارت کر رہا ہوں۔

شاعری میرے نزدیک ایک مقدّس عمل کا نام ہے۔ یہ پوری سنجیدگی، مشق، مطالعہ اور نیک نیتی کا تقاضا کرتی ہے۔ میں نے اپنے طور پر ان تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کامیاب کہاں تک ہوا ہوں اس کا فیصلہ آپ کریں گے۔

میری نظر میں غزل کا وہی شعر کامیاب ہے جس میں یا تو کچھ نیا کہا گیا ہو یا کچھ نئے ڈھنگ سے کہا گیا ہو۔ ''سفر مقدّر رہے'' میں نیا کیا کہا گیا ہے اور نئے ڈھنگ سے کیا کہا گیا ہے اس کا فیصلہ آپ بہتر طریقے سے کر

سکتے ہیں۔ میں تو بس آپ کا خیال جاننے کا متمنّی ہوں۔

شعر، شاعر اور شاعری کے تعلق سے جن خیالات کا اظہار جناب شجاعؔ خاور نے ''رشکِ فارسی'' میں ''سطحی'' کے عنوان سے کیا ہے ان میں سے بیشتر سے میں اپنے آپ کو متفق پاتا ہوں۔

ایک بات مجھے اپنی غزلوں کے مقطعوں کے سلسلے میں کہنی ہے۔ میرے بیشتر مقطعوں میں آپ کو تعلّی نظر آئے گی مگر میں یہ عرض کر دوں کہ یہ میری خود پسندی، خوش فہمی یا زعم کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایسا اس لئے ہے کہ میرے خیال میں تعلّی ہی مقطعے کا سب سے اچھّا موضوع ہے بصورت دیگر مقطع میں تخلّص بھرتی کا لفظ بن کر رہ جاتا ہے۔

جولائی ۲۰۰۲ء سے فروری ۲۰۰۴ء تک ملازمت کے سلسلے میں مجھے آسنسول میں رہنا پڑا۔ آسنسول کلکتہ کے بعد اردو ادب کا دوسرا بڑا مرکز ہے۔ اس شہر کے لوگ شاعری اور مشاعروں کے بڑے دیوانے ہیں۔ یہاں کے لوگوں نے مجھے جتنی عزّت دی وہ بہت کم لوگوں کے حصّے میں آتی ہے۔ مجھے سر آنکھوں پر بٹھایا گیا۔ مختلف علاقوں میں میرے اعزاز میں نشستیں ہوئیں۔ میری صدارت میں مشاعرے ہوئے۔ کلٹی میں میرے نام سے ایک شام منائی گئی۔ فروری ۲۰۰۴ء میں جب میں تبادلے کے بعد آسنسول کو خیر باد کہنے والا تھا تو اس وقت میرے اعزاز میں الوداعیہ مشاعرہ برپا کیا گیا۔ میری شان میں نظمیں اور قطعات پڑھے گئے۔ مجھے تحفے تحائف دیئے گئے۔ مختصر یہ کہ ڈیڑھ سال کا وہ عرصہ میری اب تک کی ادبی زندگی کا سنہرا دور بن گیا۔ میں آج اپنی اس کتاب کے ذریعہ آسنسول کے تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ ہمیشہ مجھے اپنی محبتوں سے نوازتے رہیں گے۔

میں شکر گزار ہوں جناب ڈاکٹر مظفرؔ حنفی اور جناب علقمہؔ شبلی کا جنہوں نے میری شاعری سے متعلق اپنی مختصر مگر گراں قدر آراء سے نوازا۔ میرے شکریے کے مستحق جناب ظہیرؔ غازی پوری اور جناب سلیم شہزادؔ بھی ہیں جنہوں نے میرے فن پر تفصیلی مضمون لکھنے کی زحمت گوارہ کی۔

کتاب چھپوانا بڑی مشکل اور دشوار کام ہے۔ کمپوزر کے یہاں بار بار دوڑنا، پریس کے چکّر لگانا، بائنڈر کے یہاں حاضری دینا، یہ سارے مرحلے آسان نہیں ہوتے۔ مگر خدا بھلا کرے چھوٹے بھائی عزیزی جاوید نہال حشمی کا جنہوں نے مجھے ان ساری صعوبتوں اور دشواریوں سے بچالیا۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ بڑی عرق ریزی سے پورے مسوّدے کی کمپوزنگ اور سرورق کی ڈیزائننگ خود کی بلکہ کاغذ خریدنے سے لے کر بائنڈنگ کروانے تک کی ساری ذمّہ داری اپنے سَر لے لی۔ اس طرح ان کی محنتوں کے طفیل یہ کتاب چھپ کر آپ کے ہاتھوں تک پہنچ سکی ہے ورنہ میں اب تک یہ مجموعہ چھپوانے کا ارادہ ہی کرتا رہ جاتا۔ اس لئے ان کا شکریہ نہ ادا کرنا بھی بددیانتی ہوگی۔

اس مجموعے کی اشاعت میں میری خواہش کے ساتھ ساتھ بڑے بھائی ڈاکٹر معصومؔ شرقی اور عزیز دوست پروفیسر عاصمؔ شہنواز شبلی کے پُرزور اور پُرخلوص اصرار کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ اس لئے اگر یہ مجموعہ آپ کو پسند آئے تو ان دونوں حضرات کا شکریہ ضرور ادا کریں۔ پسند نہ آنے کی صورت میں بُرا بھلا بھی انہیں ہی کہیں مجھے معاف فرمائیں۔

احقر

احمد کمالؔ حشمی

کانکی نارہ

احمد کمال حشمی کی غزل میں تازہ کار انسلاکات

ظہیر غازی پوری، ہزاری باغ

غزل، احساس لطیف، ذوقِ جمال اور تہذیب فکر سے عبارت ہوتی ہے۔ یہ اردو شاعری کی امتیازی شان اور معراج بھی ہے اور ذہنِ شاعر کی بالیدگی کی مظہر بھی۔ اس میں شاعر کی فکری اساس، عملی اجتہاد اور تجرباتی وسعت کبھی موج برآب کی طرح اور کبھی زیریں لہروں کی مانند ہمیشہ رواں دواں رہتی ہے۔ غزل ایمائی اندازِ بیان اور رمزیہ طریقۂ اظہار کا تقاضہ کرتی ہے۔ اسے نو بہ نو تشبیہات، تازہ تر استعارات اور پیکر تراش لفظ و زبان سے آراستہ کرنا لازمی ہے۔ انسان کے طور طریقے، رہن سہن اور سوچ کے زاویئے تقریباً یکساں ہوتے ہیں۔ ایسے میں شاعر اگر اپنی آپ بیتی، جگ بیتی اور مشاہدات کو سیدھے سادے انداز میں نظم کر دے تو اس کے شعر و غزل میں نہ تو انفرادیت ہوگی اور نہ وہ خوبی جو شعریت اور کیفیت کی غماز ہوتی ہے۔ ایسی شاعری بحر و وزن میں ہونے کے باوجود سپاٹ بیانی اور نثریت کا شکار ہو جاتی ہے۔ ایک سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ہر دور میں غزل کہنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود رہی ہے مگر ان میں سے گنتی کے شعراء نے اپنی شناخت قائم کی اور ہمیشہ کسی نہ کسی زاویئے سے ان کے فکر وفن کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کا خاص سبب یہی ہے کہ ان شعراء نے غزل کو کسی نہ کسی پہلو سے نئی تاب و تب، دلکشی اور معنوی رعنائی و گیرائی سے آراستہ کیا ہے۔ ہماری ادبی تاریخ شاہد ہے کہ غزل کو فکر و فن کے نئے تلازموں سے ہم رکاب کرنے والے فن کاروں کی قدر افزائی بہر حال ہوتی رہی ہے اور آئندہ بھی یہی سلسلہ جاری رہے گا۔ لکیریں پیٹنے والے شعراء بھیڑ میں کھو جائیں گے اور نئے شعری رویّوں کو بروئے کار لانے والے غزل نگار معراجِ مقبولیت حاصل کریں گے۔

اس حقیقت سے کوئی ادب نواز انکار نہیں کر سکتا کہ ہر عہد میں نئی نسل کے شعراء نئے عزم اور ولولہ کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور اپنے ہم عصر بزرگ شعراء کرام کے شانہ بہ شانہ چلتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنے علم اور تجربہ کے عکس و نقش سے دیارِ شعر و فن میں نئی جوت جلائیں۔ غور کیا جائے تو یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ غزل پوری طرح صرف انہیں شعراء کو شرفِ قبولیت بخشتی ہے جو غور و فکر کو اوّلیت دیتے ہیں، دنیا بھر کے شعر و ادب کی بدلتی ہوئی جہتوں کو سمجھنے پرکھنے کی سعی کرتے ہیں اور مشق و ممارست کے ساتھ رموزِ فن سے آشنائی حاصل کرتے ہیں۔ نئی نسل کے جن شعراء نے ان نکات کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور کامیابیاں حاصل کی ہیں ان میں احمد کمال حشمی کا نام بھی نمایاں ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ وہ تواتر سے لکھ رہے ہیں اور ادبی جرائد میں شائع بھی ہو رہے ہیں۔ اب تک انہوں نے اتنی تعداد میں غزلیں کہہ لی ہیں کہ اپنا مجموعہ شائع کرا سکیں۔ انہوں نے اپنی بعض غزلوں میں صنفِ غزل سے اپنی والہانہ وابستگی کا اظہار پوری شدّت سے کیا ہے۔ ان میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو صنفِ غزل کے وقار کا احساس دلاتے ہیں اور اس قسم کے اشعار بھی ہیں جو تعلّی اور خود پسندی کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار ؎

غالبؔ کو سمجھا ، میرؔ کو برسوں بہت پڑھا

پختہ ہوا شعور تو پہلی غزل کہی

☆☆☆☆☆☆☆☆

ہر رنگ میں زمانے کو دیکھا ہے اس لئے
کالی غزل کہی کبھی بھوری غزل کہی

☆☆☆☆☆☆☆☆

میں نے کمالؔ میر تقی میرؔ کی طرح
جب بھی غمِ حیات نے مارا ، غزل کہی

''غزل کہی'' کی ردیف میں ان کی تین غزلوں سے میں نے ایک ایک شعر یعنی کل تین شعر نقل کئے ہیں۔ان میں تین خاص باتیں ہیں۔پہلی یہ کہ انہوں نے میرؔ و غالبؔ کو خوب پڑھا اور سمجھا اور جب شعور پختہ ہوگیا تو پہلی غزل تخلیق کی۔دوسری یہ کہ زمانے کے ہر رنگ کو دیکھا بھالا،اس کے نشیب وفراز کا جائزہ لیا اور تب کالی نیز بھوری غزل کہی۔کالی غزلیں باقرؔ مہدی لکھا کرتے ہیں۔ان کا اپنا مطمع نظر ہے جس کے تحت وہ کھردری یا کٹی پھٹی غزلیں لکھتے ہیں لیکن احمد کمالؔ حشمی کی غزلوں میں مجھے کہیں اس نوعیت کا کالا پن یا بھورا پن نظر نہیں آیا۔میں ان کی کالی اور بھوری غزل الگ الگ کر کے مطالعہ کرنے میں ناکام رہا۔تیسری بات یہ ہے کہ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ میر تقی میرؔ کی طرح جب ان پر غم کے پہاڑ ٹوٹے ہیں تو انہوں نے دامنِ غزل میں عافیت تلاش کی ہے مگر یہ بات صدفی صد صحیح نہیں ہے۔ انہوں نے شہد میں بھگو کر تیکھی غزل بھی کہی ہے،ایک بے وفا کے یاد آنے پر بھی غزل کہی ہے اور شراب پی کے طہوری غزل بھی کہی ہے۔

احمد کمالؔ حشمی کے اشعار پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ شاعری انہیں ورثہ میں ملی ہے اور طبع موزوں انہیں قدرت کی جانب سے ودیعت ہوئی ہے۔لہٰذا جب بھی زندگی اور حالات نے انہیں شعر گوئی پر آمادہ کیا ہے انہوں نے غزل کہی ہے۔اس کی توثیق خود انہیں کے ایک شعر سے ہوجاتی ہے ۔

دل پر پڑی جو چوٹ تو رہ پائے کب خموش
کہنا تھا کچھ نہ کچھ تو ضروری ، غزل کہی

گویا جب کبھی کچھ کہنا ضروری ہوا تو انہوں نے شعر کہے یا غزل لکھی۔دوسرے لفظوں میں انہوں نے اپنے جذبہ واحساس کو شعر کا جامہ پہنایا۔ان کی غزلوں میں ایسے بھی اشارے ملتے ہیں کہ جس شاعر نے ان کے شعر چُرائے ،اس نے ان پر تنقید کی اور جو اَنا فروش تھے انہوں نے لوگوں کی مدح میں قصیدے قلمبند کئے اور دولت کمائی مگر انہوں نے ''جی حضوری'' سے خود کو محفوظ رکھا،خسارہ برداشت کیا اور غزل کہی۔

احمد کمالؔ حشمی نے ایک دہائی میں شہرت کی ان بلندیوں کو چھولیا ہے جہاں تک اکثر شعراء کئی دہائیوں میں بھی نہیں پہنچ پاتے۔شاید کامرانی کے انہیں احساسات نے ان سے اس قسم کے اشعار بھی کہلوائے ہیں ۔

کمالؔ ! سب سے الگ ہے تمہارا طرزِ سخن
غزل کے شعر تمہارے عجیب ہوتے ہیں

.....

کمالؔ ، تؤ تو سخنور بڑا عجیب سا ہے

.....

ہم اپنی ذات میں سورج سے کم نہیں یارو
ہمارے سامنے جلتا نہیں کسی کا دیا

.....

لوگ ہماری غزلیں پڑھ کر
اپنے اوپر دم کرتے ہیں

.....

انگلی پکڑ کے میری جو چل رہا تھا کل تک
کیسے قبول کر لوں میں اس کی سربراہی

.....

شاعری محض سخن سازی تک محدود نہیں ہوتی، خصوصیت سے غزل شاعر سے تازگیٔ فکر، مضمون آفرینی، ایجاز، ایمائیت اور استعاراتی لب ولہجہ میں اظہار خیال کا تقاضا کرتی ہے۔ احمد کمالؔ حشمی ان فکری عوامل سے بخوبی واقف ہیں لہٰذا ان کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو نہ صرف ادب پسند قارئین بلکہ سخت سے سخت نقادوں کو بھی متاثر کر سکتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جب بھی کوئی خواہش ہونے لگتی ہے
دل پر عقل کی بندش ہونے لگتی ہے

.....

میں ہواؤں میں اُڑنا چاہتا ہوں
میرے شانے پہ اپنا سر رکھو

.....

دل کے جذبات پہ موسم کا اثر ہوتا نہیں
یہ شجر وہ ہے جو پت جھڑ میں بھی پھل سکتا ہے

.....

چہرے کو شو کیس بنا دے خوشیوں کا
غم جتنے ہیں دل میں بھر دے یا اللہ

.....

ان شعروں میں دل پر عقل کی بندش، ہوا میں اُڑنے کی چاہت، پت جھڑ میں پھلنے والا شجر اور خوشیوں کے شو کیس وغیرہ ایسے تازہ کار انسلاکات ہیں جو تخلیقیت کو کیف انگیز فضا خلق کرتے ہیں۔ احمد کمالؔ حشمی کے مندرجہ بالا اشعار سے یہ ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے کہ وہ نئی غزل کے ان عناصر سے واقف ہیں جو غزل کو نئی معنویت اور تحریک انگیز لطافت سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ بقول رشید احمد صدیقی غزل اردو شاعری کی آبرو ہے اور مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ ہماری بہترین شاعری غزل ہی میں ملتی ہے۔ کلیم الدین احمد اور عظمت اللہ خاں کے فتوے اپنی جگہ، زندگی بھر غزل کے دامن میں گوشۂ عافیت تلاش کرنے والے شاعر ظفرؔ اقبال کا فرمان ہے کہ ''میں خود غزل گو ہونے کے باوجود اسے بیہودہ

صنف سخن قرار دیتا ہوں'' اور اس شاعر کی غزل میں شمس الرحمٰن فاروقی کو کلاسیکی رکھ رکھاؤ، غالبؔ کی سی پیچیدگی اور بیدلؔ کی سی طباعی نظر آتی ہے۔ جدید شعری روّیہ کی ان قلابازیوں نے نئی نسل کے بیشمار شعراء کو اس روش پر گامزن کر دیا تو افراتفری اور شکست وریخت پیدا کرنے کا رجحان ایک حد تک نئی نسل میں بھی پیدا ہو گیا۔ احمد کمالؔ حشمی کے یہاں اس نوعیت کے اشعار بہت کم ہیں مگر بعض اشعار قاری کو ذہنی جمناسٹک کرنے پر یقیناً مجبور کر دیں گے ۔

دیکھ لے پھر نمرود خدا بن بیٹھا ہے
اس کے سر میں پھر مچھر دے یا اللہ

.....

فخر مجھ کو ہے اس حماقت پر
گھاس پتھر پہ بو رہا ہوں میں

.....

ایک زمانہ میں خیال آرائی، بندش الفاظ اور قافیہ بندی کے کمالات کو اچھی شاعری کے زمرے میں رکھا جاتا تھا مگر آج کا شاعر اپنے آپ کو بھی لکھتا ہے، اپنے اندر سلگنے والی آگ کو بھی لفظ و معنی کا لباس عطا کرتا ہے اور معاشرے کی بدحالی، قدروں کی پامالی اور سیاسی بازی گری کو بھی شعر کے پیکر میں ڈھالتا ہے۔ اس طرح لفظ لفظ میں اپنے داخل اور خارج کو سموتا ہے۔ آج کی شاعری محض لطف اندوز ہونے کی چیز نہیں ہے۔ یہ بڑی یکسوئی سے اور انتہائی توجہ اور انہماک سے پڑھنے، سمجھنے اور غور کرنے کی شئے ہے جس کا براہ راست تعلق شاعر کی بصیرت اور بصارت دونوں سے ہوتا ہے۔ اس لئے تنوع موضوعات، دلکش اسالیب اور نئے وژن کی اختراع پر پورا زور صرف کیا جاتا ہے۔ احمد کمالؔ حشمی نے اس جانب توجہ دی ہے۔ نئی غزل کے امکانات پر نظر رکھی ہے اور ان عناصر کے انضباط کی کوشش کی ہے جو غزل کے شعر کو عصریت کی پہلو دار کیفیت سے ہم آہنگ کرتے ہیں اور انہیں عوام و خواص میں معتبر بناتے ہیں۔ اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہیں اور ایک بڑے طبقہ کو انہوں نے اپنا ہم نوا بھی بنا لیا ہے۔ انہوں نے غزل کے مطلعوں پر خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ ان میں برجستگی اور ذہن کو متاثر و متحرک کرنے کی خصوصیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی نئی نئی ردیفوں میں غزل کہنے کی سعیٔ بلیغ نے مفہوم و معنیٰ کی نو بہ نو قوس قزح منعکس کرنے کے مواقع فراہم کئے ہیں جو بہر اعتبار قابلِ داد ہیں۔ نمونتاً چند اشعار مندرج ہیں ۔

چراغوں کی حمایت کر رہا ہوں
میں سورج سے بغاوت کر رہا ہوں

.....

روشن ہے جو چراغ وہی کام کا چراغ
جو بجھ گیا ہے وہ ہے فقط نام کا چراغ

.....

بہروں کی ہے عدالت ، اندھوں کی ہے گواہی
حسرت سے تک رہی ہے اب میری بے گناہی
خون انسان کی ارزانی ، دیکھ جمورے دیکھ
پانی شرم سے پانی پانی دیکھ جمورے دیکھ

یہ سچ ہے اے زمیں کہ نہیں آسمان میں
اونچا ہوں پھر بھی تجھ سے کہ ہوں سائبان میں

.....

غزل کی عشوہ فنی، ہزار شیوگی اور ریزہ خیالی شاعر کو نچلا نہیں بیٹھنے دیتی۔ اس کو ہمیشہ مشق و ریاضت پر آمادہ رکھتی ہے اور زبان و اظہار پر فن کارانہ قدرت کا تقاضا بھی کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہ ہزار چہرہ صنف بڑی مشکل سے کسی کے گرفت میں آتی ہے۔ احمد کمال حشمی نے حسبِ مقدور اپنے تجربوں اور مشاہدوں کو عکس تاب کیا ہے اور سبزہ زارِ سخن میں خوش نما گل بوٹے اگائے ہیں مگر انہیں ابھی طویل سفر طے کرنا ہے کیونکہ ؎

روشنی کا یہ سفر ختم نہیں ہو سکتا
دامنِ فکر پہ اشعار کے جگنو رکھئے

کے مصداق انہیں اس سفر میں کامیابی کے نقوش متواتر مرتسم کرنے ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوتا اور تا عمر دامنِ فکر کو ضیا بار رکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ احمد کمال حشمی بقول خود اپنی زندگی کے منکر نکیر ہیں لہٰذا انہیں ناقد و مدیر کی پرواہ کئے بغیر ان وسعتوں پر کمند ڈالنی ہے جو ابھی تک قلم کے دسترس سے باہر ہیں۔ یہی سعیِ مسلسل انہیں اعزاز بھی بخشے گی اور معتبر و ممتاز ہونے کی سند سے بھی نوازے گی اور تب انہیں خود محسوس ہوگا کہ ؎

کشتِ احساس زندگی کے لئے
پھول ، پتّے سب استعارے ہیں

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

پختہ شعور کی غزل

سلیم شہزاد، مالیگاؤں

ایک مخصوص روایتی ہیئت کی پابند ہونے کے باوجود غزل اپنے بعض صنفی/ داخلی خواص کے سبب اتنے سیّال / نامیاتی اور اتنے کثیر جہات نمو پذیر شعری مظہر کی طرح ہر عہد میں اجاگر ہوتی رہی ہے کہ کیا گل و بلبل کی حقیقی/ مجازی عشقیہ داستان اور کیا دار و رسن کی سماجی/ سیاسی آزمائش، کیا اجنبیت اور بے چہرگی کے باطنی فرار کا اظہار اور کیا صفت و صارفیت کی گرم بازاری کا نظریاتی / غیر نظریاتی مابعد جدید قول محال، غزل کے آئینہ خانے میں فرد اور فنکار کی زندگی سے ہمرشتہ ہر شئے، ہر اظہار اور ہر صورت حال کو متعدد زاویوں سے عکس پذیر دیکھا جا سکتا ہے۔ صنفِ غزل کے تعلق سے یہ کہنا بے جا نہیں کہ اپنے آپ میں ایک محدود ہیئتی مظہر ہونے کے باوجود اس میں شعری لسانی اظہار کی بے شمار آزادیاں حاصل ہیں۔

نے باگ ہاتھ میں ہے نہ پا ہے رکاب میں
کے حقیقی محسوس پیکر سے لے کر اس میں

پسینہ تو سنِ ہمت کا سیلِ خانہ زیں ہے

کے وراء الورا تصور/ معنویت کی معدوم/ موہوم صورت محال تک شعری اظہار میں تشکیل دی ہوئی دیکھی جا سکتی ہے۔ حقیقی اور ماورائی شعری اظہار کے مذکورہ دونوں رویّے ہر عہد کی غزل کا وصف رہے ہیں بلکہ غالبؔ کی طرح ہر غزل گو کے یہاں دونوں کی تشکیلات کا مطالعہ بیک نظر غزلوں کے کسی دیوان میں کیا جا سکتا ہے۔ گزشتہ ربع صدی کی غزل، جسے جدید اور اینٹی غزل کے خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، غزلیہ اظہار میں زبان کے مخصوص اظہارات کی واضح مثال پیش کرتی ہے۔ اسی ذیل میں مثالی شعروں اور مثالی شعراء سے قطع نظر ''**سفر مقدر ہے**'' کے شاعر احمد کمالؔ حشمی کی غزلوں سے راست رابطہ بناتے ہیں تو مغربی بنگال کی آب و ہوا سے سرشار ان غزلوں میں شعری زبان کے استعمال کی شوخ، چنچل لہراتی دمکتی مثالوں کا ایک رنگا رنگ ہجوم کسی جشن مناتے جلوس کی طرح رواں دواں نظر آتا ہے۔

ابر اُٹھا ہے بارش ہونے والی ہے

حشمی کی اس خبر کو اپنے مطالعے کا پس منظر بنا کر ''**سفر مقدر ہے**'' کا قاری اس میں شامل غزلوں سے

آنکھ بہت گہرا سمندر/ تالاب چھوٹا سا/ سیلاب کا ڈر ہے/ رحمت برستی ہے/ سمندر کی طرف بلاتی آواز/ دریاؤں کی گہرائی/ گرداب کو سفینوں کا انتظار/ خواہش دریا/ حاجت قطرہ/ سمندر خرید کر/ گھر میں تازہ ہوا کا گزر/ کھیل دکھائے پانی/ چمکتی دھوپ میں شبنم/ سیلاب بھی آجاتا ہے/ موسم اور ہوا کی سازش/ تشنہ لبی کے آگے دریا/ دریا میں تشنگی/ چلتے رہے سیل کی طرح/ ساون کی برساتیں/ یاد کی بارش/ دریا ہے طوفانی/ بھری برسات میں

جیسی آب شاداب شعری لفظیات اخذ کر سکتا ہے۔ ویسے ہوا، پانی، سمندر، دریا، بارش اور موسم جیسی مجرد لفظیات جدید غزل کے رسمی ساختیے ہیں لیکن ان کی معنویتوں کو عصر و فکر، انفراد و اجتماع اور منظر و ماحول سے ہم آہنگ کر کے احمد کمالؔ حشمی نے جس طرح شعری پیکر تراشی کو اپنی غزلوں کا وصف بنایا ہے اسے شاعر کی فنی انفرادیت کہنا بیجا نہیں۔

احمد کمالؔ حشمی کی غزلیہ لفظیات کے مندرجہ بالا مخصوص انتخاب سے زیر نظر مجموعے کے شعری لسانی برتاؤ یعنی شاعر کے زبان و اسلوب کے تنوع اور لسانی پیکر تراشی، شعری کیف و کم میں اظہار خیال کو برتنے والے شاعر کی نجی نفسی کیفیات اور ان کا لسانی تال میل وغیرہ پہلوؤں تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اپنی غزل کے مختلف ہونے کا شدید احساس ہے شاعر کو۔ صنف غزل، اس صنف میں شعر کہنے والے دوسرے شعراء اور اس صنف کے تعلق سے سُننے اور پڑھنے والوں کے خیالات سے احمد کمالؔ حشمی اچھی طرح واقف ہیں۔ اس لئے اکثر اشعار میں وہ اپنی واقفیت کو شعری تجربے میں بدل دیتے ہیں۔ احمد کمالؔ حشمی کی غزلوں میں وہ اردو سُنائی دیتی ہے جو عوام کی اردو ہے۔ عربی فارسی کی ثقیل اور ثقہ تراکیب سے یہ مجموعہ بہت حد تک پاک ہے۔ عوامی زبان کے سارے ذائقے یہاں موجود ہیں یعنی شاعر کی نجی زبان اردو مراکز کی معیاری مرصع زبان سے الگ اپنی شناخت بناتی اور اپنی بانی سناتی ہے۔

مچھّر/ کالی بھوری غزل/ بوڑھا/ بوڑھے ماں باپ/ طوطا مینا/ پہلی تاریخ/
نالا (آہ و نالہ نہیں)/ تالاب/ جڑیں کھوکھلی/ چیل/ میل/ شوکیس/ کلنڈر/
بلڈنگ/ اسکول/ ناول/ رسالے/ پستک/ گاندھی کے اقوال/ دیمک/ کیڑے وغیرہ

الفاظ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسی بظاہر کھردری غیر شاعرانہ اور غیر روایتی لفظوں سے احمد کمالؔ حشمی نے ایک عوامی

شاعر کی طرح صاف سیدھی سچّی باتیں کہی ہیں جو ہر قاری/ سامع کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

یوں تو ''نے باگ ہاتھ میں ہے نہ پا ہے رکاب میں'' کی منتشر حالت بھی سفر کا شعری پیکر خلق کرتی ہے جس سے مسافر اور اس کے لوازم سفر اور مسافرانہ حالت اور سفر کے ماحول میں غیر مطابقت کا ایک غیر ہم آہنگ نقشہ سامنے آتا ہے۔اس کے باوجود غزل کے موضوعاتی ماحول میں

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے

کی صدا سنائی دیتی رہتی ہے جس کے نتیجے میں غزل کا ہر شعر ایک انجان بے نام منزل کی طرف سفر کے لئے ہمہ وقت کمر بستہ نظر آتا ہے۔احمد کمال حشمی کی غزلوں کے مجموعے کا شناختی نام ہی سفر کے لسانی شعری ساختیے کے، اُن کے تخلیقی عمل پر اختصاص کا اعلان کرتا دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ ان کی غزلوں کے بہت حد تک غیر غزلیہ ماحول میں سفر کرنے سے قاری ایسے بیشتر اشعار سے ملاقات کرسکتا ہے جن میں یہی سفر اپنے شاعرانہ پیکروں، علامتوں اور تشبیہی اور استعاراتی صورتوں میں جاری وساری ہے۔

یہ کم نہیں کہ ساتھ تمہارا سفر میں ہے

اور منزل نہ کوئی راہ نما، گھر سے چل پڑے

جیسی پوری غزلوں میں سفر اپنی رواں دواں رہبری/ رہزنی/ مسافر کی تنہائی/ منزل کی تلاش/ راستے/ پیچ وخم/ گرد وغبار/ ہجر وفراق وغیرہ موضوعات کے ساتھ بیکرانی کی سمت قاری کو لئے جارہا ہے۔ مجموعے کی پہلی تخلیق میں یہ دعائیہ شعر سامنے آتا ہے ؎

میں ہوں مسافر ، مجھ کو سفر کی عادت ہے
منزل لے لے ، راہ گزر دے یا اللہ

پھر بہت سے اشعار سفر کے مختلف تجربات کو تشبیہی اور استعاراتی پیکروں میں اُجاگر کرتے چلے جاتے ہیں ؎

سفر کے بعد سفر ، پھر سفر مقدر ہے
نکل پڑا تو میں لوٹا کبھی نہ گھر کی طرف

قطب نما کی ہے حاجت نہ رہنما کی مجھے
پتہ بتاتا ہے منزل کا ، راستہ مجھ کو

.....

چل پڑو تو راستے کی دھول ہیں
دشت ودریا، صحرا و کہسار، سب

.....

مسلسل چلتے چلتے چلنے والا ہار جاتا ہے
سفر پر میں نکلتا ہوں تو رستہ ہار جاتا ہے

.....

رہبر کا ساتھ چھوڑ کے ہم چل پڑے الگ
دانستہ گمرہی کا مزہ ہم سے پوچھئے

.....

ع راہ دشوار ہے، منزل ہے بہت دور ابھی

.....

ع مسافر ہوں، مسافر کو تو گھر اچھا نہیں لگتا

.....

شعری اظہار کا کھلنڈرا پن احمد کمال حشمی کی غزلوں میں ردیفوں کے منفرد انتخاب میں بھی سامنے آتا ہے۔ اس مخصوص انتخاب کو شاعر کے لسانی برتاؤ ہی کا ایک اور رُخ سمجھنا چاہئے کہ غزل کے اظہار میں (جو ردیفوں اور قافیوں کی تکرار کے سبب بہت جلد تکرار کا شکار ہو جاتا ہے) احمد کمال حشمی اپنی الگ تان اڑانے کے لئے بڑی چالاکی سے اجنبی/ نئی ردیفوں کی طرف جاتے ہیں اور واقعی سب سے الگ راگ سناتے ہیں۔ غزل/ سمندر/ دروازے/ محبت/ سفر/ روشن/ پڑھتے ہیں/ گھر سے چل پڑے/ بھلی لگتی ہے/ انتظار/ پانی/ چراغ/ دیا/ خموشی/ پتھر/ آئینہ/ زندگی جیسے مجرد اور مرکب لفظوں کو احمد کمال حشمی نے شعری معنویتوں سے شرابور کر دیا ہے۔ جدید غزل میں یہ میر و نظیر کی روایت کا احیاء ہے جو اینٹی غزل کہنے والے اور طنز و مزاح کو غزلیہ اظہار دینے والے بہت سے شعراء کے یہاں مشاہدے میں آتا ہے۔ احمد کمال حشمی اس روایت کا حصّہ بن گئے ہیں۔ اگرچہ وہ اینٹی غزل نہیں کہتے مگر غیر شاعرانہ لفظیات غزل میں برت کر انہوں نے خود کو زبان کے کلاسک، مصنوعی اسلوب اور مرصع نگاری سے الگ کر لیا ہے اور اپنے شعری اظہار کے لئے ایک ایسی زبان اختراع کی جسے روایت کا حصّہ ہونے کے ساتھ ساتھ خاص احمد کمال حشمی کی اپنی پہچان کہا جا سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تاثرات

یادش بخیر، ایک دَور تھا کہ نوزائیدہ لکھنے والے ابجد کے زینے پر پہلا قدم رکھنے سے پیشتر ترقی پسندی کا کلمہ پڑھ لیتے تھے۔ کچھ آگے چل کر جدیدیت کے دھارے میں چھلانگ لگانا تخلیق سے پہلے لازمی سمجھا گیا۔ آج قافیے اور تھیم حاصل کرنے کی غرض سے مابعد جدیدت کے شامیانے تلے نئے لکھنے والے قطار بند نظر آتے ہیں۔ ایسے میں تمام حصار بندیوں سے آزاد رہ کر شعر کہنے والا، واقعی شعر کہنے والا نظر آئے تو اُس کی پیٹھ تھپکنا لازم ہے۔ ''سفر مقدّر رہے'' کے جستہ جستہ اشعار پڑھ کر مجھے یاد آیا کہ کلکتہ میں اپنے بارہ سالہ قیام کے دوران میں جب کبھی موقعہ آیا میں نے بے تکلف کہا کہ احمد کمال حشمی اُن تین نئے شاعروں میں سے ایک ہے جس میں آگے جانے کا اِمکان نظر آتا ہے (بقیہ دو کے شعری مجموعوں پر میں قبل ازیں کچھ لکھ چکا ہوں) اب یہ 'امکان' والی بات یقین میں بدل گئی ہے۔ عموماً نیا خیال پیش کرنے کی دُھن میں نئی نسل کے فنکار اہمال کا شکار ہوجاتے ہیں۔ حشمی نازک، پیچیدہ اور نادر مضمون کو با مفہوم اور پُر تاثیر ابیات میں ڈھالنے پر قادر ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ اپنے والد محترم (حشم الرّمضان) کی بیانیہ روِش پر نہ جا کر اس نے رمزیت اور اشاریت کو فوقیت دی ہے کہ بیانیہ نظم میں اور ایمائیت غزل میں ہی سجتی اور پنپتی ہے۔ اپنے بعض جونیئر معاصرین کے برعکس حشمی نے مجموعے کی اشاعت کیلئے مناسب وقت کا انتظار کیا ہے کہ اس طرح ادھ کچرے اشعار اور ناپختہ اظہار سے نجات مل سکتی تھی۔ میں ''سفر مقدّر رہے'' کی کامیابی اور مقبولیت کے لئے دعا گو ہوں۔

(ڈاکٹر) مظفر حنفی

ساتویں دہائی کے بعد مغربی بنگال کے افق شاعری پر اُبھرنے والے شاعروں میں ایک قابل ذکر نام احمد کمالؔ حشمی کا ہے۔ انہوں نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے لیکن یہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور اسی صنف میں ان کے جوہر کھلتے ہیں۔ گزشتہ کئی سالوں سے ان کا کلام تواتر سے ادبی رسالوں میں شائع ہوکر مقبول ہو رہا ہے۔ اب یہ غزلوں کا مجموعہ ''سفر مقدّر رہے'' پیش کر رہے ہیں۔

غزل بڑی نک چڑھی صنف سخن ہے، یہ آسانی سے کسی کو منہ نہیں لگاتی۔ اس کو رام کرنے کیلئے اس کی ناز برداری اور نکھار سنگار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں رمز و کنایہ کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ شاعر اپنے ذوق و ضرورت کے مطابق گرد و پیش کی چیزوں کو علامت کے طور پر استعمال کرتا ہے اور اسی سے شعر میں دلکشی اور جامعیت پیدا ہوتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ احمد کمالؔ حشمی کو اس حقیقت کا ادراک ہے۔ ان کی غزلوں کے مطالعے سے منکشف ہوتا ہے کہ یہ جذبے کی صداقت، زبان کی لطافت اور بیان کی ندرت کو اپنی شاعری میں کلیدی حیثیت دیتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کے اشعار دل کو چھو لینے والی کیفیت رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں کہیں کہیں الفاظ و تراکیب کا غیر رسمی استعمال بھی ملتا ہے جس سے ایمائیت کے ساتھ ساتھ نئے معنوی امکانات کے در بھی وا ہوتے ہیں لیکن اس دُھن میں یہ شعری روایات اور فنّی نکات کو پس پشت نہیں ڈال دیتے۔ یہ اپنے عہد کے نئے موضوعات اور جدید امکانات کو بھی اپنی غزلوں کے اشعار میں پیش کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ بعض مقامات پر زیریں لہروں کی طرح احتجاجی اور طنزیہ رویے کی نشاندہی بھی کی جاسکتی ہے لیکن اس کے باوجود ان کے اشعار دور از فہم اور مبہم نہیں ہوتے۔

علقمہ شبلی

اہلِ خرد کو پاگل کر دے یا اللہ
اور دیوانوں کو پتّھر دے یا اللہ

ابر اُٹھا ہے بارش ہونے والی ہے
بھیگ نہ جاؤں اک چھپّر دے یا اللہ

میں ہوں مسافر مجھ کو سفر کی عادت ہے
منزل لے لے ، راہ گزر دے یا اللہ

چہرے کو شو کیس بنا دے خوشیوں کا
غم جتنے ہیں دل میں بھر دے یا اللہ

دی ہے زباں تو پھر زورِ گفتار بھی دے
یا پھر مجھ کو گونگا کر دے یا اللہ

دیکھ لے پھر نمرود خدا بن بیٹھا ہے
اس کے سر میں پھر مچّھر دے یا اللہ

میرے یاروں کی تعداد زیادہ ہے
مجھ کو سانپوں کا منتر دے یا اللہ

تیرا کمالؔ اب تجھ سے منّت کرتا ہے
اس کی دعاؤں میں تو اثر دے یا اللہ

تقلید میں کبھی نہ کسی کی ، غزل کہی
ہم نے تو سب سے ہٹ کے انوکھی غزل کہی

طرزِ سخن یہ میرا ، یہی میرا رنگ ہے
میں نے بھگو کے شہد میں تیکھی غزل کہی

غالبؔ کو سمجھا ، میرؔ کو برسوں بہت پڑھا
پختہ ہوا شعور تو پہلی غزل کہی

اس وقت بھی غزل کہی جب شادماں ہوئے
جب غم سے چور ہو گئے تب بھی غزل کہی

ہم نے تو روشنائی سے بس لکھّے چند شعر
دل کا لہو ملایا تو لمبی غزل کہی

اس بے وفا نے مجھ کو سخنور بنا دیا
جب یاد آئی مجھ کو وہ لڑکی ، غزل کہی

لفظوں سے کھیلتے رہے جدّت کے نام پر
یاروں نے اے کمالؔ! پہیلی غزل کہی

اس سے ملا تو مل کے ادھوری غزل کہی
بچھڑا تو اس کے ہجر میں پوری غزل کہی

الہامی کیفیت جو ہوئی تب ہوئے ہیں شعر
میں نے کہاں کبھی بھی شعوری غزل کہی

دل پر پڑی جو چوٹ تو رہ پائے کب خموش
کہنا تھا کچھ نہ کچھ تو ضروری ، غزل کہی

احساسِ قرب رہتا ہے تو رہتا ہوں خموش
محسوس کی ہے جب کبھی دوری ، غزل کہی

ہر رنگ میں زمانے کو دیکھا ہے اس لئے
کالی غزل کہی کبھی بھوری غزل کہی

ہم میکدے میں بیٹھ کے کرتے ہیں شاعری
ہم نے شراب پی کے طہوری غزل کہی

ہم نے شبِ سیاہ میں روشن کئے چراغ
ظلمت سے سخت جنگ کی ، نوری غزل کہی

سچّا ہر ایک شعر کہا میں نے اے کمالؔ
پوری غزل کہی کہ ادھوری غزل کہی

بیتے دنوں نے جب بھی پکارا ، غزل کہی
ماضی نے جب کیا ہے اشارہ ، غزل کہی

ہر شعر میں ہے پرتوِ حسن و جمالِ یار
دیکھا جب اس کا روئے دل آرا ، غزل کہی

جب اس نے دل دیا تو کہی میں نے اک غزل
توڑا جب اس نے دل تو دوبارہ غزل کہی

تم نے قصیدہ گوئی سے دولت کمائی ہے
گرچہ ہوا ہے میرا خسارہ ، غزل کہی

باطل کی بالا دستی پہ جھنجھلا کے رہ گئے
کاغذ پہ سارا غصّہ اُتارا ، غزل کہی

میں نے کمالؔ! میر تقی میرؔ کی طرح
جب بھی غمِ حیات نے مارا ، غزل کہی

عجیب طرح کا موسم رہا ہے آنکھوں میں
بدن کا سارا لہو جم رہا ہے آنکھوں میں

کوئی بھی درد ہو رونے سے ہلکا ہوتا ہے
ہر ایک زخم کا مرہم رہا ہے آنکھوں میں

یہ پنچھی اپنا نشیمن بدلتا رہتا ہے
کبھی تو دل میں، کبھی غم رہا ہے آنکھوں میں

میں آنسوؤں کو تبرّک سمجھ کے پیتا ہوں
چھپا ہوا کہیں زمزم رہا ہے آنکھوں میں

عجب نہیں ہے کہ کل باندھ ٹوٹ ہی جائے
ابھی تو سیلِ بلا تھم رہا ہے آنکھوں میں

کسی کی دید کا لمحہ گزر چکا کب کا
ابھی بھی جشن کا عالم رہا ہے آنکھوں میں

جو دل میں ہو وہ ہمیشہ دکھائی دیتا ہے
وہ دور رہ کے بھی پیہم رہا ہے آنکھوں میں

دکھائی دیتی ہے ہر شَے مجھے حسین کمالؔ
کسی کے حُسن کا البم رہا ہے آنکھوں میں

سفر میں آتے ہیں مجھ کو نظر در و دیوار
ہیں میرے ساتھ مرے ہم سفر در و دیوار

کسی بھی چھت کو بلندی کبھی نہیں ملتی
انہیں بٹھاتے نہ سر پر اگر در و دیوار

کسی کسی کو ہی آتا ہے گھر بنانے کا فن
بنا تو لیتا ہے ہر اک بشر در و دیوار

جنوں میں اور خرد میں عجب کشاکش ہے
طویل راہ ادھر ہے ، ادھر در و دیوار

ہیں ہجرتیں ہی مقدّر تو مُڑ کے کیوں دیکھوں
کہیں نہ کر دیں مری آنکھ تر در و دیوار

یہ کم نہیں ہے کہ ہم خواب میں بناتے ہیں
بنا سکے نہ زمیں پر اگر در و دیوار

ہمارے عزمِ سفر کو ضعیف کرتے ہیں
گھٹائیں ، میل کے پتھر ، شجر ، در و دیوار

میں اس مکان کے اندر بھی جا چکا ہوں کمالؔ
حسیں نہیں ہیں مکیں ، جس قدر در و دیوار

نہ اس کی یاد جاتی ہے نہ اس کا غم نکلتا ہے
کچھ ایسی دل کی حالت ہے کہ میرا دم نکلتا ہے

اچھل کر ہم سری کی کوششیں کرتے ہیں وہ لیکن
ہمارے قد سے ان کا قد ہمیشہ کم نکلتا ہے

یہاں چہرے ہیں یاروں کے مگر دل دشمنوں کے ہیں
یہاں امرت کے پیالے سے بھی اکثر سم نکلتا ہے

تری چارہ گری کی ، چارہ گر! حاجت نہیں ہم کو
ہمارے زخم سے ہی زخم کا مرہم نکلتا ہے

بدن پر گھاؤ جتنے تھے وہ سارے بھر گئے لیکن
جو دل کے زخم ہیں ان سے لہو پیہم نکلتا ہے

یہ میزائل کی دنیا ہے نہ دنگل ہے نہ رَن کوئی
لڑائی ہو تو اب گھر سے کہاں رستم نکلتا ہے

حسیں چہروں کی محفل میں دل اپنا لے کے مت جاؤ
چمکتی دھوپ میں لے کر کوئی شبنم نکلتا ہے؟

بے قرار میں بھی ہوں ، بے قرار دروازے
میرے ساتھ کرتے ہیں انتظار دروازے

میرے دل کی دھڑکن کی کر رہے ہیں عکّاسی
بند ہو کے کھلتے ہیں بار بار دروازے

کچھ پتہ نہیں چلتا غم کدھر سے آتا ہے
زندگی میں ہوتے ہیں بے شمار دروازے

دل ہے وہ مکاں جس کے اس پہ پھر نہیں کھلتے
جس پہ بند ہوتے ہیں ایک بار دروازے

دل ہے چور زخموں سے ہونٹوں پر تبسّم ہے
گھر خزاں رسیدہ ہے ، پُر بہار دروازے

شامِ غم میں بھی یارو میں کہاں اکیلا ہوں
خیر خواہ چھت ہے اور غم گسار دروازے

اے کمالؔ جب سے وہ چھوڑ کر گیا ہے گھر
چبھ رہے ہیں آنکھوں میں خار دار دروازے

لوگ کتابیں ، ناول اور رسالے پڑھتے ہیں
اپنا شوق الگ ہے ہم تو چہرے پڑھتے ہیں

مسجد سے بھی اچھّے مجھ کو لگتے ہیں اسکول
کیوں کہ ان میں ننّھے ننّھے فرشتے پڑھتے ہیں

دن بھر دھوپ میں جلتے ہیں ہم تب اپنے بچّے
ہنستے ، کھیلتے ، کھاتے ، پیتے ، لکھتے ، پڑھتے ہیں

آج کی آہٹ میں سُن لیتے ہیں کل کی آواز
حال میں ہم مستقبل کے اندیشے پڑھتے ہیں

رقص میں شعلوں کے شامل ہیں درپردہ وہ بھی
دیر و حرم میں جو دن رات صحیفے پڑھتے ہیں

جس پستک میں لکھے ہوئے تھے گاندھی کے اقوال
اس پستک کو اب دیمک اور کیڑے پڑھتے ہیں

منصب ، تمغے ، اونچے عہدے ملتے ہیں ان کو
شان میں حاکمِ دوراں کی جو قصیدے پڑھتے ہیں

آجکل اور ایوانِ اردو ، شاعر اور شب خون
سارے رسالے مانگ کے اردو والے پڑھتے ہیں

یوں چکھّو تو پھیکا پانی
پیاس لگے تو میٹھا پانی

چاہت کا اندازہ کر لے
میں پیاسا ، تو ٹھنڈا پانی

لوگ سزائیں کاٹ رہے ہیں
دنیا بھی ہے کالا پانی

اس کی سخاوت اللہ اللہ
بھوکے کو ہے دیتا پانی

حق گوئی کا مجرم ہوں میں
بند ہے میرا حقّہ پانی

میری آنکھ سے ٹپکا ہے جو
آدھا خون ہے ، آدھا پانی

زہر ہے یا امرت ہے، مت دیکھ
حکم ہوا تو پی جا پانی

آگ بجھائے ، آگ لگائے
کھیل دکھائے کیا کیا پانی

مانا تو ہے ایک سمندر
لیکن تیرا کھارا پانی

سادہ ہے کوئی رنگ نہیں ہے
بالکل میرے جیسا پانی

سحر تا شام میں پھرتا رہا اُٹھا کر آگ
جب آئی رات تو پھر سو گیا بچھا کر آگ

جلا رہے ہیں ، کہیں آپ ہی نہ جل جائیں
ہماری مانئے رکھ دیجئے بجھا کر آگ

خبر میں رہنے کا فن اس کو خوب آتا ہے
بجھا رہا ہے ، اسے دیکھئے ، لگا کر آگ

کسی کسی سے ستم گر بھی خوف کھاتا ہے
قصیدہ پڑھتی ہے پانی کا ، سر جھکا کر آگ

تمام پیڑ پسینے میں تر تھے حدّت سے
کچھ اور تیز ہوئی جھیل میں نہا کر آگ

میں لمحہ لمحہ پگھلتا ہوں موم کی صورت
مرے وجود میں رکھ دی ہے کس نے لا کر آگ

ہے خون سرد ، حرارت کہاں سے آئے گی
عبث ہے ، لاکھ اگر تاپئے جلا کر آگ

کبھی میں موم تھا اب سنگ ہو گیا ہوں کمالؔ
ڈرا رہا تھا زمانہ دِکھا دِکھا کر آگ

سیم مٹّی کی ہے ، زر مٹّی کا ہے
پھر بھی طالب ہر بشر مٹّی کا ہے

ابتدا بھی ، انتہا بھی خاک ہے
زیست کیا ہے ، اک سفر مٹّی کا ہے

چاک پر چڑھنا ، سنورنا ، ٹوٹنا
بس یہ قصّہ مختصر ، مٹّی کا ہے

خواب کیا ہے ، خواب کا انجام کیا
اک گھروندہ ریت پر مٹّی کا ہے

میں دعا بارش کی مانگوں کس طرح
اے درختو! میرا گھر مٹّی کا ہے

نبھتی ہے دونوں میں دیکھیں کب تلک
ایک پتّھر ہم سفر مٹّی کا ہے

وضع داری عہدِ نو میں ہے کہاں
مجھ میں جو ہے وہ اثر مٹّی کا ہے

سینہ ہے فولاد کا میرا کمالؔ
اس کے اندر دل مگر مٹّی کا ہے

دیا میں جلاتا ہوں آؤ ہواؤ
مرے حوصلے آزماؤ ہواؤ

وہ چنگاری جو راکھ میں دب گئی تھی
بنی کیسے شعلہ بتاؤ ہواؤ

وہ کٹ کر پتنگیں چلی جا رہی ہیں
مری چھت پہ بھی اک گراؤ ہواؤ

کہاں کون ہے منتظر جانے کس کا
ہر اک در کو مت کھٹکھٹاؤ ہواؤ

یہ دیواریں چھت کا سہارا نہیں ہیں
یہ ہیں آنکنوں کی ، گراؤ ہواؤ

مقیّد میں کرلوں گا سانسوں میں تم کو
کبھی اس کا تن چھو کے آؤ ہواؤ

بہت ظلم ڈھانے لگا ہے یہ سورج
بتاؤ کہاں ہو؟ گھٹاؤ! ہواؤ!!

جسے ہم آنکھ کہتے ہیں بہت گہرا سمندر ہے
یقیں مانو یہ اپنے طرز کا پہلا سمندر ہے

لبوں کی پیاس کی شدّت پہ ہے موقوف ہر منظر
سمندر ہے کبھی قطرہ ، کبھی قطرہ سمندر ہے

گئی برسات تو سوکھا پڑا ہے آج وہ نالا
بھری برسات میں خود کو سمجھتا تھا سمندر ہے

میں ہوں تالاب چھوٹا سا ہجومِ تشنہ لب میں ہوں
اسے ہے زعم وسعت کا مگر تنہا سمندر ہے

تلاطم ہے نہ موجیں ہیں بھلا تالاب میں کیا ہے
لڑیں گے ہم سمندر سے عدو اپنا سمندر ہے

بہت ہے شور سینے میں مگر خاموش رہتا ہے
میں اس کا غم سمجھتا ہوں مرے جیسا سمندر ہے

بھنور میں رہنے والے کہتے ہیں دریا سمندر کو
لبِ ساحل ہیں جو ان کے لئے دریا سمندر ہے

جو پتّھر دل سمجھتے ہیں کمالؔ ان سے کوئی کہہ دے
مرے دل میں کبھی جھانکیں محبّت کا سمندر ہے

دشمنی بھی ہو تو اک معیار ہونا چاہئے
یاد رکھو سینے پر ہر وار ہونا چاہئے

دھوپ بونے والا بھی یہ چاہتا ہے دیکھئے
اُس کے سر پر پیڑ سایہ دار ہونا چاہئے

یا جنونِ زندگی ہو یا تو شوقِ مرگ ہو
آدمی کو کوئی تو آزار ہونا چاہئے

پیچ وخم میں رہروی کا لطف پنہاں ہوتا ہے
راستوں کو مثلِ زلفِ یار ہونا چاہئے

کتنے یوسف اب بھی ہیں تیار بکنے کے لئے
شرط یہ ہے مصر کا بازار ہونا چاہئے

دیکھ اپنے دل کے دروازے کا تالا کھول دے
خالی کمرے میں کرایہ دار ہونا چاہئے

ایک ٹوٹے دوسرے کی آس باقی رہ سکے
آنکھوں میں تو خوابوں کا انبار ہونا چاہئے

ساقی کی من مانیوں پر نکتہ چینی جو کرے
میکدے میں ایسا اک مَے خوار ہونا چاہئے

آئنے کے جیسا میں ہوں میرے جیسا آئنہ
ریزہ ریزہ میں ہوا ہوں ریزہ ریزہ آئنہ

دیکھنا ہے رہنے پاتا ہے سلامت کب تلک
پتھروں کی بھیڑ میں ہے اک اکیلا آئنہ

سنگ سے وہ خوف کھائے سنگ اس سے خوف کھائیں
وہ ہے تیرا آئنہ اور یہ ہے میرا آئنہ

مصلحت کے رنگ سے ہر آئنہ رنگین ہے
اب ہے نیلا ، لال ، پیلا اور کالا آئنہ

دستِ دنیا نے شکستہ کر دیا ہر ایک کو
میرا دل ہو ، شاخِ گل ہو ، خواب ہو یا آئنہ

جیسا ہو بازار کاروبار ویسا کیجئے
اب نقابیں بیچے گا جو بیچتا تھا آئنہ

دعویٰ تھا سچ بولنے کا بزم میں ہر شخص کو
اور اک گوشے میں بیٹھا ہنس رہا تھا آئنہ

عکس اُس کا بھی اُبھارے جو نظر سے دور ہو
دل جسے کہتے ہیں وہ ہے اک انوکھا آئنہ

مصلحت ہے یا سیاست ، معجزہ یا انقلاب
پتھروں کو ڈھونڈتا ہے آج کل کا آئنہ

ساری محفل میں چھڑی ہے بحث یہ اب اے کمالؔ
ٹیڑھا میڑھا چہرہ تھا یا ٹیڑھا میڑھا آئنہ

نگاہِ بار میں اچھّا ، برا ہونے سے پہلے تھا
میں جب تک اک مکھوٹا آئنہ ہونے سے پہلے تھا

مری مومی طبیعت کو بنایا تو نے ہی پتھر
میں حرفِ التجا ، شعلہ نوا ہونے سے پہلے تھا

جدائی تیری مجھ کو چین سے رہنے نہیں دے گی
خیال ایسا مرا تجھ سے جدا ہونے سے پہلے تھا

اُمنگیں، آروزئیں تھیں، تمنّائیں تھیں، جذبے تھے
بہت آباد دل صحرا نما ہونے سے پہلے تھا

یہی اعزاز کیا کم ہے میں اس کی پہلی چاہت ہوں
یہ کیا کم ہے وہ میرا غیر کا ہونے سے پہلے تھا

یہ روشن ہے تو میری زندگی بھی آج روشن ہے
مرا دل تو فقط اک دل دیا ہونے سے پہلے تھا

بہت مغرور مت ہو اے پرندو مجھ سے عبرت لو
کہ میں بھی آسماں میں پر کٹا ہونے سے پہلے تھا

ہمیشہ میرا سپنا ٹوٹتا ہے
عجب گھر ہے یہ بنتا ٹوٹتا ہے

زیادہ بوجھ دل پر ہو تو دل کیا
ترازو کا بھی پلڑا ٹوٹتا ہے

اگر ضربِ کلیم اللہ ہوگی
تو لکڑی سے بھی دریا ٹوٹتا ہے

اگر ہمّت پرندوں کی نہ ٹوٹے
تو پھر اک روز پنجرہ ٹوٹتا ہے

نہ شکوہ کیجئے دل ٹوٹنے کا
کہ شیشہ تو ہمیشہ ٹوٹتا ہے

وہ دیکھواس کی آنکھوں میں ہیں آنسو
وہ دیکھو اک ستارہ ٹوٹتا ہے

اب اُس کی یاد بھی آتی نہیں ہے
چلو اب یہ بھی ناتا ٹوٹتا ہے

کمالؔ اس سے تعلق توڑ ڈالو
ہمیشہ جس کا وعدہ ٹوٹتا ہے

سدا جھوٹے کو کوّا کاٹتا ہے
مگر سچّے کو کتّا کاٹتا ہے

نیا سادھو بہت دھونی رمائے
نیا ہر ایک جوتا کاٹتا ہے

مسیحا کی مسیحائی تو دیکھو
ہرا ہے زخم ، ٹانکا کاٹتا ہے

ستم کو روکئے تیغ و تبر سے
کہ لوہا ہی تو لوہا کاٹتا ہے

ستم گر کا یہ اندازِ ستم ہے
گلا میرا وہ آدھا کاٹتا ہے

بہت اچھّا مجھے لگتا ہے جگنو
کسی حد تک اندھیرا کاٹتا ہے

ترا ہنسنا کِھلائے پھول دل میں
ترا رونا کلیجہ کاٹتا ہے

بڑا وِدوان بننے کے جنوں میں
ہے جس ڈالی پہ بیٹھا ، کاٹتا ہے

دھوکے سے کربلا میں بلایا گیا مجھے
ابن علی کی طرح ستایا گیا مجھے

خنجر کی پیاس کیسے بجھے ، اک سوال تھا
اس کا جواب دینے کو لایا گیا مجھے

جھوٹی ستائشوں سے مجھے خوش کیا گیا
نشّہ پلا پلا کے گرایا گیا مجھے

آنکھوں پہ پٹّی باندھ کے تلوار دی گئی
اَن دیکھے دشمنوں سے لڑایا گیا مجھے

کچّا ہی مجھ کو توڑا زمانے نے شاخ سے
اور پھر کسیلا کڑوا بتایا گیا مجھے

شانہ ہلا کے مجھ کو جگایا نہیں گیا
اک خوفناک خواب دکھایا گیا مجھے

سکّہ بنا دیا گیا بچّے کے ہاتھ کا
کھویا گیا مجھے کبھی پایا گیا مجھے

میں تو ہوں ایک درد بھرا گیت اے کمالؔ
عیش و طرب کی بزم میں گایا گیا مجھے

ایک گوشے میں پڑا رہتا ہے بوڑھا گھر میں
طاق پر جیسے کہیں کوئی صحیفہ گھر میں

ہم ہیں آوارہ، ہمیں دشت و جبل پیارے ہیں
ہم کو آتا نہیں رہنے کا سلیقہ گھر میں

بوڑھے ماں باپ کی خدمت میں لگا رہتا ہوں
میرا کعبہ بھی ہے گھر میں، میرا طیبہ گھر میں

رٹتا رہتا ہے شب و روز ترا نام فقط
میرے سینے میں ہے دل یا کوئی طوطا گھر میں

ایک تنہائی ہے، سنّاٹا ہے، خاموشی ہے
اپنے گھر میں نہیں، میں رہتا ہوں مُردہ گھر میں

وہ مصاحب ہے، وہ دربار میں یوں رہتا ہے
جیسے رہتا ہو کوئی پالتو کتّا گھر میں

اس طرح قید ہیں دل میں مرے دنیا کے غم
جانور قید ہوں جیسے کسی چڑیا گھر میں

پہلی تاریخ مہینے کی ہے سو آج کمالؔ
سب کا پیارا ہوں میں سب کا ہوں چہیتا گھر میں

جو تیز دوڑتے تھے بہت جلد تھک گئے
ہم دھیرے دھیرے چلتے ہوئے دور تک گئے

فطرت بدل سکی نہ کسی خار کی کبھی
پھولوں سے کر کے دوستی پتّے مہک گئے

اترن پہن کے شاہ کی خوش ہیں مصاحبین
سورج سے بھیک مانگ کے ذرّے چمک گئے

یاروں نے زخمِ دل کا مرے یوں کیا علاج
آئے تھے خون پونچھنے رکھ کر نمک گئے

کچھ دور جا کے ان کو بھی زک دے گیا کوئی
جو لوگ ہم سے آگے ہمیں دے کے زک گئے

ہنس کر لپک لپک کے ہوا دے رہے تھے جو
کچھ شعلے ان کی سمت بھی ہنس کر لپک گئے

آنکھوں کو انتظار میں پردے پہ ٹانک کر
چوکھٹ سے پوسٹر کی طرح ہم چپک گئے

وہ شاعری بھی ہے کہ نہیں سوچئے کمالؔ
نامِ غزل پہ آپ بہت کچھ تو بک گئے

گھٹا ہے نہ کوئی شجر ، لوٹ جاؤ
کڑی دھوپ کا ہے سفر ، لوٹ جاؤ

کبھی وار پیچھے سے کرتا نہیں میں
مرے دشمنو! بے خطر لوٹ جاؤ

مرے بھائیو! یہ روایت ہے ، تم بھی
کنویں میں مجھے پھینک کر لوٹ جاؤ

بھلا تیغ و نیزہ کو کیا دے سکو گے
نہ رکھتے ہو سینہ نہ سر ، لوٹ جاؤ

بہت دور جا کر بچھڑنے سے بہتر
یہ ہے ابتدائے سفر ، لوٹ جاؤ

مکینِ مکاں ہیں سماعت سے عاری
دریچہ کھلے گا نہ در ، لوٹ جاؤ

یہاں سب کی آنکھوں پہ ہیں کالے چشمے
ہے باقی تمہاری نظر ، لوٹ جاؤ

سناؤ کمالؔ اپنے اشعار گا کر
ترنّم نہیں ہے تو گھر لوٹ جاؤ

ٹوٹے اک خواب تو آنکھیں نہیں پھوڑا کرتے
جینے والے کبھی جینا نہیں چھوڑا کرتے

تم نے کوشش کبھی کی ہی نہیں اے مظلومو
آگ ہو جاتے تو آہن کو بھی موڑا کرتے

وار ہم کرتے ہیں دشمن پہ سدا جاں لیوا
ہم کبھی شیر کو زخمی نہیں چھوڑا کرتے

کب تلک پیاس لئے بھٹکو گے دریا دریا
پھاوڑا لے کے زمیں کیوں نہیں کوڑا کرتے

اپنی آنکھوں میں ہم آنسو نہیں آنے دیتے
اپنے دل کا کبھی بھانڈا نہیں پھوڑا کرتے

خود غرض اتنے ہیں منزل پہ پہنچنے والے
راہ میں نقشِ قدم بھی نہیں چھوڑا کرتے

پاؤں میں ہوں تو بھلے پھوٹیں کہ کچھ پھول کھلیں
دل میں جو ہوتے ہیں پھوڑے، نہیں پھوڑا کرتے

یہ الگ بات کہ ہم پھولوں پہ چلتے ہیں کمالؔ
وقت پڑ جائے تو پتّھر بھی ہیں توڑا کرتے

گا کر مشاعروں میں سُنانا تو ہے نہیں
میری غزل غزل ہے یہ گانا تو ہے نہیں

دنیا سُنے بھی حالِ غمِ دل تو کیوں سُنے
یہ کوئی دل فریب فسانہ تو ہے نہیں

راہِ وفا میں ساتھ چلے گا وہ کتنی دور
ہم ساتھ چل پڑے ہیں ، یہ جانا تو ہے نہیں

پتھر بھی کھائے اور سدا مُسکرائے بھی
ہر شخص میری طرح دِوانہ تو ہے نہیں

دیوانگی میں ہم کو مزہ آگیا بہت
اب ہم کو پھر سے ہوش میں آنا تو ہے نہیں

اُٹھے نہ کوئی ٹیس لہو بھی نہیں رِسے
ہر زخم دل کا اتنا پرانا تو ہے نہیں

وعدے بہت کریں گے سیاسی یہ رہنما
ان کو کوئی بھی وعدہ نبھانا تو ہے نہیں

دنیا سے دھوکے کھاتا رہا ہے سدا کمالؔ
بھولا ہے ، سادہ دل ہے ، سیانا تو ہے نہیں

میں ادھورا ہوں ابھی تک کبھی پورا ہو جاؤں
کوئی ہو جائے مرا اور میں کسی کا ہو جاؤں

راہ دشوار ہے ، منزل ہے بہت دور ابھی
جانے کس روز میں کس موڑ پہ تنہا ہو جاؤں

تھک گیا ہوں میں اب اتنا کہ خیال آتا ہے
میں بھی اب عشق کروں اور نکمّا ہو جاؤں

اتنی قیمت نہ رکھو میری کہ میں بِک نہ سکوں
اور شو کیس ہی میں رہ کے پرانا ہو جاؤں

اپنی نظروں پہ تو رکھ قابو ، میں رکھّوں دل پر
مجھ کو مت دیکھ تو ایسے کہ دِوانہ ہو جاؤں

بیٹھا رہتا ہوں میں جب بزمِ تصوّر میں تری
مجھ کو آواز کوئی دے تو میں غصّہ ہو جاؤں

اپنی آنکھوں کو میں دو ہاتھوں سے ڈھانپوں کب تک
اس سے اچھّا تو یہی ہے کہ میں اندھا ہو جاؤں

سرحدوں نے کیا انسانوں کو تقسیم ، کمالؔ!
اس لئے سوچتا ہوں میں کہ پرندہ ہو جاؤں

پر تعفّن ہے فضا چلئے یہاں سے چلئے
صاف پانی نہ ہوا چلئے یہاں سے چلئے

شہر ہے پھولوں کا پتھر ہیں حکومت کرتے
ہے یہاں ظلم روا چلئے یہاں سے چلئے

آیا ، کچھ دیر رُکا ، سب سے مِلا ، غور کیا
پھر مرے دل نے کہا چلئے یہاں سے چلئے

دیکھتے سب ہیں مگر بولتا کوئی بھی نہیں
لب کُشائی ہے خطا چلئے یہاں سے چلئے

آپ شیشے کے بنے لوگ ہیں پتھر کے یہاں
چلئے چلئے بہ خدا چلئے یہاں سے چلئے

لوگ دولت کی ترازو پہ چڑھا دیں نہ کہیں
لے کے آپ اپنی انا چلئے یہاں سے چلئے

چہرے سب لوگوں کے اس شہر میں ہیں مسخ شدہ
آپ آئینہ نما چلئے یہاں سے چلئے

زیست کی قید کی میعاد ہوئی پوری کمالؔ
ہو گئی ختم سزا چلئے یہاں سے چلئے

''آپ لاکھوں کی طرف میں ہوں بہتّر کی طرف''
میں شجاعت کی طرف آپ ہیں لشکر کی طرف

جان بخشی کے لئے آج کا ہر پورس اب
ملتجی نظروں سے تکتا ہے سکندر کی طرف

میں کنارے پہ بہت دیر نہیں رہ سکتا
ایک آواز بلاتی ہے سمندر کی طرف

اک جنوں ہے جو سفر پر مجھے اُکساتا ہے
اک کشش ہے جو مجھے کھینچتی ہے گھر کی طرف

پہلے شدّت سے میں تکتا تھا گھڑی کی جانب
اب تو حسرت سے میں تکتا ہوں کلنڈر کی طرف

اپنے ہاتھوں میں قلم میں بھی اُٹھا لیتا ہوں
ہاتھ جب اپنا بڑھاتا ہے وہ خنجر کی طرف

مجھ کو احساس نہ ہونے لگے تھک جانے کا
میں کبھی تکتا نہیں میل کے پتھر کی طرف

میری آنکھوں کا مقدّر ہیں اندھیرے اب تو
میں نے دیکھا تھا کبھی مہر منوّر کی طرف

مانا گھٹا نہ پیڑ کا سایہ سفر میں ہے
یہ کم نہیں کہ ساتھ تمہارا سفر میں ہے

رہبر کے پیچھے چلنے کا یہ دَور اب نہیں
منزل اسے ملے گی جو تنہا سفر میں ہے

حیرت زدہ ہیں راستے ، حیران سنگِ میل
اندھے کی رہنمائی میں لنگڑا سفر میں ہے

تو میرے ساتھ چلنے سے پہلے یہ سوچ لے
جنگل سفر میں ہے ، کہیں صحرا سفر میں ہے

میں چل پڑا ہوں رستے میں عزمِ سفر کے ساتھ
کوئی قطب نما ہے نہ نقشہ سفر میں ہے

نکلا تھا میں سفر میں جسے گھر سے چوم کر
ہمراہ میرے اب بھی وہ چہرہ سفر میں ہے

اب میرے ہم سفر کے بچھڑنے کا وقت ہے
کیوں کہ اب اس کے بعد اندھیرا سفر میں ہے

رُکنا نہیں ، رکو گے تو مَر جاؤ گے کمالؔ!
یہ کہہ رہا ہے دل جو ہمیشہ سفر میں ہے

منزل نہ کوئی راہ نما گھر سے چل پڑے
آوارگی کا لینے مزہ گھر سے چل پڑے

گوتم کی طرح ہم نے بھی چُپ چاپ ایک رات
گھر میں کسی سے کچھ نہ کہا گھر سے چل پڑے

دیوار و در میں قید ہیں گھر بھی ہے اک قفس
احساس ہم کو جب یہ ہوا گھر سے چل پڑے

لمبے سفر سے لوٹ کے آئے تھے گھر میں ہم
پھر بھی سفر سے جی نہ بھرا گھر سے چل پڑے

ہم منتظر سے تھے ، اس کو یہ اندازہ ہو سکے
دروازہ ہم نے رکھّا کھُلا گھر سے چل پڑے

سر پر بلا کی دھوپ تھی ، پاؤں تلے تھی ریت
کرنا تھا ہم کو وعدہ وفا ، گھر سے چل پڑے

مقتل کی سرزمیں نے ہمیں جب بھی دی صدا
دیوار و در کا بوسہ لیا گھر سے چل پڑے

رختِ سفر میں باندھ لیا ہم نے اے کمالؔ
بیوی کا بوسہ ، ماں کی دعا گھر سے چل پڑے

زمانے بھر میں ہیں یوں تو ہمارے صد دشمن
ہیں دوستوں میں بھی شامل کئی عدد دشمن

کہیں سے سنگ چلے آ کے ہم کو لگتا ہے
ہجومِ سر میں بنا ہے ہمارا قد دشمن

مرے خلوص پہ شک مت کرو رفیقو تم
مرے خلوص کی دیں گے تمہیں سند دشمن

عطا ہوئی ہیں ہمیں نفرتیں وراثت میں
گئے زمانوں میں تھے میرے اس کے جد دشمن

نہ میں سکندرِ اعظم ہوں اور نہ تو پورس
عداوتوں کی مقرّر نہ کر تو حد دشمن

نہ دشمنی میں مزہ ہے نہ لطف یاری میں
ہے معتبر کوئی یار اور نہ مستند دشمن

مرے عدو مری خاطر ہیں میرا آئینہ
سنوار دیتے ہیں چہرے کے خال و خد دشمن

نبھائی جائے سلیقے سے دشمنی تو کمال
کوئی بھی رہ نہیں سکتا ہے تا ابد دشمن

زندگی میں دھمال ہے ہی نہیں
جینے کا اب سوال ہے ہی نہیں

زخم آئے ہیں پیٹھ پر میری
یہ تو دشمن کی چال ہے ہی نہیں

دیوتا خوش نہیں ہے پوجا سے
کیوں کہ سونے کی تھال ہے ہی نہیں

دیکھنے کا عمل بھی دل کا ہے
آنکھ کا کچھ کمال ہے ہی نہیں

ہر بدن کو نچوڑ کر دیکھا
خوں کسی کا بھی لال ہے ہی نہیں

آج کل ہر سخی ہے غصّے میں
کوئی دستِ سوال ہے ہی نہیں

دل تو یونہی اُداس رہتا ہے
کوئی وجہِ ملال ہے ہی نہیں

بزمِ شعری میں خاک لطف آئے
آج احمد کمال ہے ہی نہیں

ہو عداوت مری زمانے سے
آ کے لگ جاؤ میرے شانے سے

ان کے سجنے سے سجنے لگتے ہیں
خواب آنکھوں میں کچھ سہانے سے

نارِ نمرود پھول بنتی ہے
بے خطر اس میں کود جانے سے

سینہ آتش فشاں نہ بن جائے
خواہشوں کا گلا دبانے سے

دن کو سورج طلوع ہوتا ہے
رات کو اک دیا جلانے سے

یہ ہے مقتل ، یہاں کی رسم عجیب
ناک کٹتی ہے سر بچانے سے

کبھی مت سوچو زندگی کیا ہے
جان جائے گی جان جانے سے

باز آجایئے کمالؔ میاں
اپنے یاروں کو آزمانے سے

جگنوؤں اور ستاروں کی ہو تمثیل کوئی
ظلمتِ زیست میں روشن کرے قندیل کوئی

ایک معصوم فرشتے نے اُڑایا ہے جسے
اس کبوتر کو جھپٹ لے نہ کہیں چیل کوئی

شبِ وعدہ یہی ہوتا ہے سحر ہونے تک
ٹھونکتا رہتا ہے سینے میں سدا کیل کوئی

کوئی تاریخ کلنڈر میں مرے سرخ نہیں
میری قسمت میں نہیں لکھّی ہے تعطیل کوئی

زلزلے آتے ہیں خوابوں کے نگر میں اکثر
نہ کرے اونچے مکاں کی کبھی تشکیل کوئی

دو قدم چل کے ہی لگتا ہے کوئی رہبر سا
ہم سفر لگتا نہیں چل کے بھی دو میل کوئی

چال ہر شخص کی اس دَور میں شطرنجی ہے
ہے پیادہ کوئی ، گھوڑا کوئی اور فیل کوئی

آج ہر شخص کسی در کا بھکاری ہے کمالؔ
لے کے پھرتا نہیں گو کاندھے پہ زنبیل کوئی

وہ مجھے اک خوبصورت کاغذی گھر دے گیا
اور پھر کچھ کالے بادل سر کے اوپر دے گیا

لے گیا خود پھول، خوشبو، چاندنی، قوس قزح
اور مجھ کو خاک، دلدل، خار، کنکر دے گیا

وقت نے یوں پتّے بانٹے زندگی کے تاش کے
چار اِکّے اس کو، مجھ کو چار جوکر دے گیا

غوطہ زن نے پائے موتی، اہل ساحل خالی سیپ
حسب ہمّت کچھ نہ کچھ سب کو سمندر دے گیا

جس نے مجھ سے مات کھائی دشمنی میں بار بار
مات آسانی سے مجھ کو دوست بن کر دے گیا

مجھ پہ اک احسان کا وہ ذکر کرتا ہے سدا
بوجھ شانوں سے ہٹا کر بوجھ دل پر دے گیا

مجھ کو اپنی دوستی کی لاج رکھنی تھی کمالؔ
پی گیا میں ہنس کے جب وہ زہر ہنس کر دے گیا

غموں سے چور ہوتا جا رہا ہوں
خوشی سے دور ہوتا جا رہا ہوں

میں اک مدّت سے گھر میں بیٹھے بیٹھے
تھکن سے چور ہوتا جا رہا ہوں

جلائے شمع کوئی زندگی میں
شبِ دیجور ہوتا جا رہا ہوں

جسے چھٹی کبھی ملتی نہیں ہے
میں وہ مزدور ہوتا جا رہا ہوں

کسی مفلس کا سپنا ہوں کہ شیشہ
میں چکنا چور ہوتا جا رہا ہوں

جلا کر راکھ کر دے اے تجلّی
میں کوہِ طور ہوتا جا رہا ہوں

دیا ہوں، تیرگی جب سے بڑھی ہے
بہت پُر نور ہوتا جا رہا ہوں

مجھے محسوس ہوتا ہے یہ ہر پل
کہ میں کافور ہوتا جا رہا ہوں

بدلتی ہے ہوا ، گرگٹ بھی رنگ اپنا بدلتا ہے
مگر کوئی کہاں کم ظرف کے جیسا بدلتا ہے

میں اب منّت سماجت چھوڑ کر تلوار اُٹھاتا ہوں
مرض اچھّا نہ ہو تو ڈاکٹر نسخہ بدلتا ہے

تم اپنے دوستوں کو داستانِ غم سُناتے ہو
بھلا شیشے کے گھر میں بھی کوئی کپڑا بدلتا ہے

ہمشہ سوچتا رہتا ہے بوڑھا باپ اکیلے میں
کمانے لگتا ہے تو کیوں ہر اک بیٹا بدلتا ہے

غمِ جاناں ، غمِ دوراں ، قفس یہ بھی قفس وہ بھی
رِہا دل ہو نہیں پاتا فقط پنجرہ بدلتا ہے

محبت ختم ، تجھ کو میں عدو اعلان کرتا ہوں
سُن اب اے بے وفا تجھ سے مرا رشتہ بدلتا ہے

کبھی دولت ، کبھی شہرت ، کبھی طاقت ، کبھی حکمت
اسیرِ مصلحت ہے وہ درِ سجدہ بدلتا ہے

کمالؔ اس شہر کا جب بھی بدلتا ہے کبھی موسم
یہاں ہر آدمی کپڑے نہیں چہرہ بدلتا ہے

ہر سو اک سنّاٹا ہے ، خاموش رہو
شہر کا منظر کہتا ہے ، خاموش رہو

غور سے دیکھو قفل پڑے ہیں ہونٹوں پر
ہر چہرے پر لکھّا ہے ، خاموش رہو

آگ کی زد میں آج ہوں میں، کل تم ہو گے
تم خاموش ہو؟ اچھّا ہے ، خاموش رہو

مانتا ہوں تم سچّے ہو پر تنہا ہو
اس کے پیچھے دنیا ہے ، خاموش رہو

میری مانو چکھ کر کہہ دو میٹھا ہے
جانتا ہوں پھل کھٹّا ہے ، خاموش رہو

شام ہوئی ہے ، رات کا آنا باقی ہے
درد ابھی تو ہلکا ہے ، خاموش رہو

ہم سفری کا اے دعویٰ کرنے والو
آگے ٹیڑھا رستا ہے ، خاموش رہو

اس کی غزل بے وزن سہی، پڑھنے دو کمالؔ
مشاعرے میں چلتا ہے خاموش رہو

میں اُس کو یاد نہ آؤں یہ خیر، ممکن ہے
وہ مجھ کو یاد نہ آئے ، یہ غیر ممکن ہے

کھنڈر ہو ، دشت ہو ، صحرا ہو یا سمندر ہو
ہو تیرا ساتھ تو دنیا کی سیر ممکن ہے

بلندیوں پہ پہنچ کر نہ تو اچھل اتنا
پھسل بھی سکتا ہے اک روز پیر، ممکن ہے

کوئی بتا دے یہ دریا میں رہنے والوں کو
وہ ٹھان لیں تو مگرمچھ سے بیر ممکن ہے

بچھڑ کے تم سے میں زندہ بھی رہ نہیں سکتا
بتاؤ! سانس ہوا کے بغیر ممکن ہے؟

شناوری کا ہے دعویٰ تو پھر جھجھک کیسی
خلاف موجِ بلا کے بھی تیر ، ممکن ہے

کمالؔ رُک نہیں جانا کہ سوئے مئے خانہ
ملے گا کوئی حرم ، کوئی دیر ممکن ہے

غزل کہی تو وہی پردۂ سخن میں رہے
تمام رنگ غزل کے، غزل کے فن میں رہے

مقابلے میں ابھی آئے گا زمیں کا چاند
گگن کے چاند سے کہہ دو ابھی گگن میں رہے

یہ سوچ کر میں نے محفل سجائی یادوں کی
بھلے میں تنہا رہوں دل تو انجمن میں رہے

غمِ حیات سے لڑتے رہے مسلسل ہم
سپاہی جیسے کہ مصروفِ جنگ رن میں رہے

بچھڑ کے اپنوں سے یہ سوچتا ہوں میں اکثر
کہ چودہ سال شری رام کیسے بَن میں رہے

تمہیں یہ فیصلہ کرنا ہے آج مظلومو!
''لہو زمیں پہ گرے یا لہو بدن میں رہے''

ہر ایک بات زباں پر نہ اپنی لاؤ کمالؔ
ضروری ہے کہ کوئی بات من کی من میں رہے

جب رکھّا ہے میرے دوست نے خنجر خرید کر
گردن پہ میں نے رکھ لیا اک سر خرید کر

تکتا رہا میں پیاس کی شدّت لئے ہوئے
اور لے گیا وہ سارا سمندر خرید کر

کاٹے گا گھر کا کتّا بھی سوچا نہ تھا کبھی
بے خوف تھا میں سانپ کا منتر خرید کر

دل جامِ جم ہے جام سفالیں نہیں ہے یار
یہ شَے نہ لا سکو گے مکرّر ، خرید کر

دنیا نے میرے قدموں میں رکھّا تھا کل اسے
جو تاج تو نے رکھّا ہے سر پر خرید کر

ہم نے سمجھ لیا ہے اب اس دَور کا مزاج
گل بیچ ڈالے ، رکھ لئے پتّھر خرید کر

اب تو مشاعروں کا ہوا حال یہ کمالؔ
پڑھنے لگے ہیں غزلیں ، سخن ور خرید کر

ذہن و دل پر نشّہ چھایا جاتا ہے
مجھ میں کوئی آج سمایا جاتا ہے

دیوانوں کی آبلہ پائی سے سیکھو
سنگ پہ کیسے پھول کِھلایا جاتا ہے

اپنی قسمت ہے پھل دار درختوں سی
سوکھ گئے تو کاٹ گرایا جاتا ہے

اپنے دل کو جھوٹی آس دلاتا ہوں
جیسے بچّے کو بہلایا جاتا ہے

دھیما لہجہ اچھّا لگتا ہے لیکن
بہروں کے آگے چلّایا جاتا ہے

کاندھے پر کا بوجھ تو ہلکا ہوتا ہے
وزنی ہے ، جو دل پہ اُٹھایا جاتا ہے

جب بھی اُن سے عرضِ تمنّا کرتا ہوں
کل کے وعدے پر ٹرخایا جاتا ہے

سن اے یار کمالؔ اب تیری غزلوں میں
اکثر اچھّا شعر بھی پایا جاتا ہے

شاخوں پر جب پھول اور پتّے اُگ آئے
خشک شجر سے رشتے سب کے اُگ آئے

جب بھی ہمارے آبلے پھوٹے صحرا میں
آگ اُگلتی ریت سے پودے اُگ آئے

تیری یاد کے جب دروازے بند کئے
دل میں روشندان ، دریچے اُگ آئے

شاخِ گل پر طوطا تھا ، اک مینا تھی
پلکوں پر شبنم کے قطرے اُگ آئے

بس اک تیرا ساتھ نہیں تو رستے میں
دیکھ لے کتنے خار نکیلے اُگ آئے

دیوانوں نے ہار نہ مانی ظلمت سے
سورج ڈوبا ، چاند ستارے اُگ آئے

سب ہیں اچھّی صورت والے تو پھر کیوں
آئینوں میں بھدّے چہرے اُگ آئے

موسم نے یہ کیسی ہوا سے سازش کی
ہر اک گھر سے آگ اور شعلے اُگ آئے

میں کھلا دل کا دریچہ نہیں رہنے دیتا
گھر میں سامان اچکّا نہیں رہنے دیتا

میں عدو کو بھی محبت سے منا لیتا ہوں
دیر تک میں کبھی جھگڑا نہیں رہنے دیتا

میں تو انسان تھا ایمان بچاتا کیسے
وہ فرشتوں کو فرشتہ نہیں رہنے دیتا

ہے خیال اس کا بھی اک چور کی مانند کہ جو
دل کے دروازے پہ تالا نہیں رہنے دیتا

محفلوں میں مجھے رکھتا ہے وہ تنہا تنہا
اور تنہائی میں تنہا نہیں رہنے دیتا

ذہن کو میرے، مرے دل کو، مری آنکھوں کو
وہ ستم گر کبھی یکجا نہیں رہنے دیتا

ایک پردیسی جو پردیس میں ہے برسوں سے
کسی پنجرے میں پرندہ نہیں رہنے دیتا

جھرّیوں سے بھرا اک ہاتھ ہمیشہ اے کمالؔ
میرے ماتھے پہ پسینہ نہیں رہنے دیتا

ہر ایک سمت ، ہر اک گام ، جابجا روشن
یہ میری راہ میں ہیں کس کے نقشِ پا روشن

چراغِ آس کے بجھنے سے جب اندھیرا ہوا
تو زیست میں نہ ہوا پھر کوئی دیا روشن

جو جل رہا ہے سرِ راہ ہر کسی کے لئے
تو اس دیئے کو سدا رکھنا اے خدا روشن

ہوا کے جیسا مرے ساتھ تھا سلوک اس کا
بجھایا اس نے ، تھا جس نے مجھے کیا روشن

چراغ دل کا سرِ شام بجھ گیا ہے کبھی
کبھی کبھی یہ دیا رات بھر رہا روشن

مری نگاہ میں جگنو بھی اک مجاہد ہے
جہاں اندھیرا بڑھا وہ وہیں ہوا روشن

ہوائیں ہنستی ہیں اس کی لپک جھپک پہ بہت
وہ اک دیا جو ہوا ہے نیا نیا روشن

وہ کوئی اور نہیں ہے سوائے ماں کے کمالؔ
لبوں پہ جس کے سدا رہتی ہے دعا روشن

راہ میں خار ہو یا کھائی بھلی لگتی ہے
عشق ہو جائے تو رسوائی بھلی لگتی ہے

اک طوائف ہی سہی ایک کشش ہے اس میں
زندگی لاکھ ہو ہرجائی بھلی لگتی ہے

چلنے والوں کو سکھاتی ہے سنبھل کر چلنا
مجھ کو رستے پہ جمی کائی بھلی لگتی ہے

ایک دن زور سے دل میرا دھڑک اٹھّا تھا
اسی دن سے مجھے تنہائی بھلی لگتی ہے

میں شناور ہوں ، کسی جھیل سے کیا لینا مجھے
مجھ کو دریاؤں کی گہرائی بھلی لگتی ہے

آپ مفلس ہیں تو زرداروں سے مت ملئے کبھی
پھٹی پوشاک پہ کب ٹائی بھلی لگتی ہے

میرے دل میں تری یادوں کے اُجالے بکھرے
چاندنی رات میں انگنائی بھلی لگتی ہے

آئینہ سب کو دکھاتے تو ہو پر سوچو کمالؔ!
کس کو اِس دَور میں سچّائی بھلی لگتی ہے

کر اہتمام تو جگنو زمیں میں بونے کا
یہی بنیں گے سبب کل سحر بھی ہونے کا

مہم چلی ہے تمام آئینوں کو صاف کرو
کسی کو ہوش کہاں اپنا چہرہ دھونے کا

سبھی خرید رہے تھے چمکتے پیتل کو
کسی نے دام بھی پوچھا نہ میلے سونے کا

ستم ہو ، یاد ہو ، احسان ہو کہ زخم کوئی
کیا ہے دل نے سدا کام بوجھ ڈھونے کا

اکیلی موجِ بلا ماری ماری پھرتی ہے
اسے تھا شوق بہت ، کشتیاں ڈبونے کا

نشہ سا ایک رگ و پَے میں دوڑتا جائے
ہے عشق نام ہی محسوس ایسا ہونے کا

ترے فراق میں دن دن نہ رات رات ہے اب
نہ جاگنے کا کوئی وقت ہے نہ سونے کا

گل کھلے ، چاند بھی نکلا ، کئی جگنو آئے
دل کو اس وقت ملے چین کہ جب تو آئے

اس کو دیکھا تو نگاہوں میں ستارے چمکے
دل کی شاخوں پہ تمنّا کے پکھیرو آئے

جم کے بارش ہو تو سیلاب بھی آ جاتا ہے
شدّتِ غم سے نہ کیوں آنکھ میں آنسو آئے

زیست کا بس وہی قصّہ ہے مکمل ، جس میں
بات خوشیوں کی بھی ہو ، غم کا بھی پہلو آئے

جس سے بھی ملتا ہے دل اس کا چُرا لیتا ہے
وہ عجب شخص ہے اس کو کوئی جادو آئے

میں تو تدبیر سے تقدیر بنا لیتا ہوں
میری قسمت میں کوئی راہو کہ کیتو آئے

اک زباں ہی نہیں تہذیب بھی اردو ہے کمالؔ
آدمی وہ ہے مہذّب جسے اردو آئے

یار سارے اور رشتے دار سب
مجھ سے کرتے ہیں زبانی پیار سب

زندگی بھی جنگ کا میدان ہے
اپنے غم سے بر سر پیکار سب

کون ہمسائے کی لیتا ہے خبر
اپنے اپنے گھر کے پہرے دار سب

سورجوں کے وارے نیارے ہو گئے
کٹ گئے ہیں پیڑ سایہ دار سب

جا رہے ہیں بات کرنے امن کی
لے کے اپنے ہاتھ میں تلوار سب

چل پڑو تو راستے کی دھول ہیں
دشت و دریا ، صحرا و کہسار سب

تنہا تنہا ہارنے والو! سنو
مل کے کوشش تو کرو اک بار سب

جس کو میرے نام سے ہے چڑ کمالؔ!
یاد اس کو ہیں مرے اشعار سب

اِس کے گھر، اُس کے گھر چراغ جلے
کب سرِ رہ گزر چراغ جلے

گھر جلے جس سے اس کو گل کر دو
گر جلے ، بے ضرر چراغ جلے

دل کے کمرے میں گھپ اندھیرا تھا
اس نے ڈالی نظر ، چراغ جلے

آندھیوں سے یہ جا کے کہہ دے کوئی
ہو کے سینہ سپر چراغ جلے

روز جلتا ہوں ہجر میں تیرے
جس طرح رات بھر چراغ جلے

ہر طرف اب ہیں قمقمے روشن
سوچتا ہے کدھر چراغ جلے

اس کے دیوار و در ہیں کاغذ کے
اس کی ضد ہے مگر چراغ جلے

کون دیکھے گا اس کی سمت کمالؔ
چاندنی میں اگر چراغ جلے

روشن ہے جو چراغ وہی کام کا چراغ
جو بجھ گیا ہے وہ ہے فقط نام کا چراغ

مجھ کو رگڑ کے دیکھئے نکلے گا ایک جِن
ہر گز نہ مجھ کو جانئے بے دام کا چراغ

لاکھوں مکاں جلائے ہیں پھونکی ہیں بستیاں
اب راوَنوں کے ہاتھ میں ہے رام کا چراغ

سب کو کہاں نصیب ہے اک جیسی زندگی
کوئی چراغِ صبح ، کوئی شام کا چراغ

ہے زندگی میں اس سے اُجالا چہار سو
روشن ہے میرے دل میں ترے نام کا چراغ

داخل نہ ہو سکے گی کوئی صبح کی کرن
جب تک جلے گا ذہنوں میں اوہام کا چراغ

روشن تو کرتا رہتا ہے کس کے لئے کمآل
در کا کبھی چراغ ، کبھی بام کا چراغ

چراغ غم کا جلے یا جلے خوشی کا دیا
جلائے رکھنا لبوں پہ سدا ہنسی کا دیا

جو ماہتاب ہیں محتاج آفتاب کے ہیں
مرے خدا تو مجھے کر دے جھونپڑی کا دیا

ہم اپنی ذات میں سورج سے کم نہیں یارو
ہمارے سامنے جلتا نہیں کسی کا دیا

اسی عناد میں روشن کسی کا رہ نہ سکا
ہر ایک شخص نے چاہا جلے اسی کا دیا

بس ایک رات کو گرہن میں چاند کیا آیا
ہر ایک جگنو جلانے لگا تھا گھی کا دیا

طلوع ہوگا اخوّت کا کل نیا سورج
چلو جلائیں ابھی مل کے دوستی کا دیا

جگر میں درد، نمی آنکھوں میں، نظر میں خواب
ہمارے پاس ہے جو کچھ وہ ہے اسی کا دیا

تنہائی میں چھت ، دروازے باتیں کرتے ہیں
تیرے بارے میں سب مجھ سے باتیں کرتے ہیں

پھر میں اپنے آپ سے گھنٹوں باتیں کرتا ہوں
کبھی وہ مجھ سے جب دو لمحے باتیں کرتے ہیں

اس کی ڈالی ڈالی پھولوں سے بھر جاتی ہے
دو پریمی جس پیڑ کے نیچے باتیں کرتے ہیں

کل گلشن میں نعرہ بن کر اُبھرے گی آواز
آج قفس میں چند پرندے باتیں کرتے ہیں

سچ تو یہ ہے سچ کو چھپانا مشکل ہوتا ہے
بند زبانیں ہوں تو چہرے باتیں کرتے ہیں

وصل کی شب میں ایک دیا بھی چپ ہو جاتا ہے
ہجر کی شب میں چاند ستارے باتیں کرتے ہیں

ان کی خوشامد ہم سے نہ ہوگی ہم چُپ رہتے ہیں
نقّادوں سے شعر ہمارے باتیں کرتے ہیں

ان سے نہیں تو ہم ان کی یادوں کے ساتھ کمالؔ
سوتے ، جاگتے ، بیٹھتے ، اُٹھتے باتیں کرتے ہیں

کبھی تو آفتاب ہے دنیا
کبھی سر پر سحاب ہے دنیا

چند کانٹے تو اس میں ہوں گے ہی
ایک برگِ گلاب ہے دنیا

نت نئے تجربوں کے مکتب کا
اک مکمّل نصاب ہے دنیا

جس کا نشّہ کبھی اترتا نہیں
ایک ایسی شراب ہے دنیا

پڑھتے سب ہیں سبھی سمجھتے نہیں
شاعری کی کتاب ہے دنیا

ایک چیچک زدہ سے چہرے پر
خوبصورت نقاب ہے دنیا

تھوڑی تھوڑی کسی کی ہو تو ہو
پر مری بے حساب ہے دنیا

اے کمالؔ اس کے پیچھے مت بھاگو
کچھ نہیں ہے سراب ہے دنیا

برسوں سے جستجو ہے تری کب ملے گا تو
وہ جا، وہ دن بتا دے جہاں جب ملے گا تو

اے دردِ دل! تو مجھ سے ابھی دور ہے تو کیا
میں جانتا ہوں آ کے سرِ شب ملے گا تو

تو ہی ہے میری آنکھیں بھی اور تو ہی خواب بھی
بھر پور نیند سوؤں گا میں جب ملے گا تو

تیری زباں پہ پیاس ہے میرے بدن میں خون
مجھ سے پڑا ہے کام تجھے اب ملے گا تو

ہر سانس اک نصاب ہے ہر سانس تجربہ
دنیا میں روز داخلِ مکتب ملے گا تو

تو پورا ہو گیا ہے ادھورا ہوں میں ابھی
میں تجھ کو مل گیا ہوں مجھے کب ملے گا تو

میں نے شدید پیاس لبوں پر سجائی ہے
بس اس امید پر کہ لبالب ملے گا تو

میں تو تجھے ایاز سمجھتا تھا اے کمالؔ
سوچا نہ تھا کہ طالبِ منصب ملے گا تو

زخم زخم پھولوں کی سُرخیاں نہیں جاتیں
چبھ گئی ہیں جو دل میں کرچیاں نہیں جاتیں

زورِ غم کے طوفاں کا دھیرے دھیرے گھٹتا ہے
اشک تھم گئے لیکن ہچکیاں نہیں جاتیں

اے ستم کے مارو ، تم زور زور سے چیخو
منصفوں کے کانوں تک سسکیاں نہیں جاتیں

چل رہے ہیں سب لیکن قافلہ نہیں بنتا
رہروؤں کی آپس کی دوریاں نہیں جاتیں

ان کی بھی طبیعت کچھ مجھ سے ملتی جلتی ہے
جاتی ہیں جدھر موجیں ، مچھلیاں نہیں جاتیں

باز دل نہیں آتا اس کو یاد کرنے سے
اس شریر بچّے کی شوخیاں نہیں جاتیں

رہتے رہتے موجوں میں عادی ہو گئیں اتنی
ساحلوں کی جانب اب کشتیاں نہیں جاتیں

تھوڑی اشک شوئی سے دردِ دل نہ کم ہو گا
تھوڑی بارشیں ہوں تو گرمیاں نہیں جاتیں

خلافِ موجِ رواں تیرتی ہوئی مچھلی
سکھاتی ہے ہمیں اندازِ زندگی مچھلی

ہر ایک پل مرے دل کے عمیق دریا میں
کسی کی یاد کی رہتی ہے اک ہری مچھلی

یہی رواج ہے دریا کا اور دنیا کا
نگل ہی جاتی ہے ہر چھوٹی کو بڑی مچھلی

بغیر غم کے خوشی کا کوئی وجود نہیں
بغیر کانٹوں کے ہوتی نہیں کوئی مچھلی

دوانہ ہوگا تو زنداں میں در بنا لے گا
کہ قید مٹھّی میں رہتی نہیں کبھی مچھلی

کریہہ شکل ہے خود کیکڑا مگر پھر بھی
وہ چاہتا ہے ملے اس کو بھی پری مچھلی

ہے خوف کھاتی اگر پانی سے تو حیرت کیا
بہت بڑی ہے ، مگر ہے تو کاغذی مچھلی

پکڑ تو رکھی ہے تم نے مگر یہ سُن لو کمالؔ
پھسل ہی جائے گی اک روز زیست کی مچھلی

سیر کرتے ہیں جو دریا کے کنارے آ کر
کبھی تو سمجھیں وہ موجوں کے اشارے آ کر

اتنی اُنچائی پہ مت جاؤ کہ ڈر لگنے لگے
پھر یہ چاہو کہ کوئی تم کو اُتارے آ کر

شرط یہ اپنی سخاوت کی رکھی ہے اس نے
بر سرِ بزم کوئی ہاتھ پسارے آ کر

بیچ دریا میں جو کشتی میں تھے سہمے سہمے
آنکھ دریا کو دکھاتے ہیں کنارے آ کر

میرے دل میں تری یادوں کی ہیں شمعیں روشن
سج گئے ہیں مری پلکوں پہ ستارے آ کر

خوشبوؤں ، جگنوؤں ، تاروں میں رہا کرتا ہوں
جب تلک رہتا ہوں میں پاس تمہارے آ کر

اتنی بے شرم ہے دنیا کہ ضرورت ہو تو
سر جھکا دیتی ہے قدموں پہ ہمارے آ کر

اس قدر بھیڑ ہے ہر سمت کہ تنہائی کمالؔ
چھپ گئی گھر میں مرے خوف کے مارے آ کر

گھنے جنگل میں رہتی تھی لڑکی
مجھ کو دیکھا تو ڈر گئی لڑکی

دونوں رکھتے ہیں ایک سی قسمت
میرا دل اور غریب کی لڑکی

تیرے بستر پہ سو بھی سکتی ہے
یار دنیا ہے مطلبی لڑکی

چاند تکتا ہے اس کو حسرت سے
جیسے گوری کو سانولی لڑکی

میری غزلوں کی صورتیں ہیں سب
گل ، صبا ، مشک ، چاندنی ، لڑکی

کبھی دنیا ہے بوڑھی اک عورت
اور کبھی ایک چھوٹی سی لڑکی

میری غزلوں میں ذکرِ دار و رسن
ان کی غزلوں میں آج بھی لڑکی

اے کمالؔ اس سے دوستی مت رکھ
ہے سیاست بہت بُری لڑکی

لمحہ تمہاری یاد کا ٹالا کسی طرح
سمجھا بجھا کے دل کو سنبھالا کسی طرح

دنیا کسی طرح بھی موافق نہ تھی مرے
دنیا کو اپنے سانچے میں ڈھالا کسی طرح

سقراط میں نہیں ہوں مگر پھر بھی بارہا
میں نے پیا ہے زہر کا پیالہ کسی طرح

سازش تھی پیچھے والوں کی میری شکست میں
برتر نہیں تھا سامنے والا کسی طرح

منظر وہ سامنے ہے کہ چپ رہنا ہے محال
ہونٹوں پہ ڈال رکھّا ہے تالا کسی طرح

سورج نہیں ، میں چاند نہیں ، جگنو ہی سہی
پھیلا رہا ہوں میں بھی اجالا کسی طرح

جو پاؤں میں تھے ، پھوٹ گئے اچھے ہو گئے
دل میں جو تھا وہ پھوٹا نہ چھالا کسی طرح

ناقد تری غزل کو سراہے گا اے کمالؔ
اردو کا اک نکال رسالہ کسی طرح

امیرِ شہر ہے زَر کے نشے میں چُور بہت
ہے مفلسی میں ہی حاصل مجھے سرور بہت

ہے پختہ عمر کی عورت کی جیسی یہ دنیا
اسے دلوں کو لبھانے کا ہے شعور بہت

اشارہ کرنا پڑا مجھ کو پاؤں کی جانب
پروں پہ اپنے تھا طاؤس کو غرور بہت

بشیر بدرؔ کی غزلیں وہ چھپ کے پڑھتی ہے
وہ کچّی عمر کی لڑکی ہے باشعور بہت

بدلتے رہتے ہیں موسم کے ساتھ رشتے بھی
بہار آئی تو آنے لگے طیور بہت

یہ دل نہیں ہے کئی خواہشوں کا مدفن ہے
یہ وہ جگہ ہے بنے ہیں جہاں قبور بہت

کمالؔ تیری غزل معتبر نہیں ہے ابھی
تری پہنچ سے ہے دلّی ہنوز دور بہت

دیکھئے تو زندگی ہے ہر طرف
پھر یہ کیسی بے حسی ہے ہر طرف

گھر ہمارا جل رہا ہے دیکھئے
روشنی ہی روشنی ہے ہر طرف

ہر طرف ہر چیز ہے اپنی جگہ
پھر بھی لگتا ہے کمی ہے ہر طرف

امن ہے یا کرفیو ہے کیا ہے یہ
خامشی ہی خامشی ہے ہر طرف

ہونے والا ہے نہ جانے کیا یہاں
شہر دل میں سنسنی ہے ہر طرف

ہو رہا ہے امن کا اعلان بھی
اور اک اک سنتری ہے ہر طرف

ہر قدم پر رہنما ہی رہنما
اس لئے تو گمرہی ہے ہر طرف

آفتاب وقت سے ہے اک سوال
کچھ بتا کیوں تیرگی ہے ہر طرف

آدمی کے قریب اور پاس آدمی
آدمی سے مگر ناشناس آدمی

دھوکہ سونے کا پیتل پہ ہونے لگا
ریشمی کپڑوں میں ہے کپاس آدمی

ایک مغرور ہے ، اک مصاحب صفت
اک درخت آدمی ، ایک گھاس آدمی

کیوں مچلتا نہیں ، کیوں ہمکتا نہیں
میرا دل ہے کہ کوئی اُداس آدمی

نیم کی پتّیوں کو چباتے ہوئے
بھول جائے گا اک دن مٹھاس آدمی

بادہ خواری نہیں ، آب نوشی نہیں
اب لہو سے بجھاتا ہے پیاس آدمی

ایٹمی دَور کی ایٹمی دوڑ میں
بن نہ جائے کہیں اتّہاس آدمی

ثواب و زہد کا بھی ایک پیمانہ ضروری ہے
جہاں مسجد ہو، مندر ہو وہاں میخانہ ضروری ہے

حسیں رخسار پر غازہ مَلو تو حُسن بڑھتا ہے
حقیقت پر ذرا سا رنگِ افسانہ ضروری ہے

ارادہ کرنے والوں میں عمل پیرا بھی کوئی ہو
ہر اک بزمِ خرد میں ایک دیوانہ ضروری ہے

مکانِ دل کا دروازہ کھلا رکھنا بجا لیکن
کسی گوشے میں اس کے ایک تہہ خانہ ضروری ہے

کبھی خود سے بھی ملنے کا کوئی لمحہ میسّر ہو
جوار و قرب میں شہروں کے ویرانہ ضروری ہے

عجب یہ فیصلہ اب کے سُنایا میرے منصف نے
کرو یا مت کرو تم جرم ، جرمانہ ضروری ہے

ستم پیہم کرو لیکن کبھی تھوڑا کرم بھی ہو
جہاں پر دام ہوتا ہے وہاں دانہ ضروری ہے

کمالؔ اس کا ہی قصّہ روز لے کر بیٹھ جاتے ہو
اسے کیا یاد کرتے رہنا روزانہ ضروری ہے؟

چڑھاوے قیمتی سب آج کے بھگوان لیتے ہیں
پجاری قیمتیں دیتے ہیں تب وردان لیتے ہیں

ہم ان میں سے نہیں ہیں جو سرِ تسلیم خم کر کے
امیرِ شہر کا ہر قول بے جا مان لیتے ہیں

ستم ہو یا کرم ہم نے ترا ہر رنگ دیکھا ہے
''تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں''

دِوانے پن کی حد ملحوظ رکھتے ہیں دِوانے اب
جنوں والے خرد کی بات بھی اب مان لیتے ہیں

علاجِ تشنگی اب ڈھونڈتے ہیں کل جو دریا تھے
کبھی جو دان دیتے تھے وہی اب دان لیتے ہیں

حسیں چہرے کسی کو چین سے رہنے نہیں دیتے
کسی کا دل چُراتے ہیں کسی کی جان لیتے ہیں

نہ بن جائے تعلق بوجھ بس یہ سوچ کر اکثر
ہم اپنوں کے بجائے غیر کا احسان لیتے ہیں

کمالؔ اپنی طبیعت سے ہمیں نقصان ہے، پھر بھی
جو ہنس کر بولتا ہے اس کو اپنا جان لیتے ہیں

ہے اس میں حسن ذرا کم ، ادا زیادہ ہے
شراب پھیکی ہے لیکن نشہ زیادہ ہے

خوشی کی نہر پہ پہرے غمِ حیات کے ہیں
یہ زیست زیست ہے کم کربلا زیادہ ہے

مکاں کھڑے ہیں مکانوں کے شانوں سے لگ کر
مکیں مکیں میں مگر فاصلہ زیادہ ہے

کبھی چکا نہیں پاؤ گے قرض سانسوں کا
کہ سود اصل سے بھی دوگنا زیادہ ہے

وہاں کمی تھی ہوا کی ، گھٹن سی ہوتی تھی
یہاں بھی رُکتی ہیں سانسیں ، ہوا زیادہ ہے

چراغ دل کا بدن کے لہو سے ہے روشن
یہی سبب ہے کہ اس میں ضیا زیادہ ہے

امیرِ شہر کی ناراضگی کا کیا شکوہ
قصور وار ہماری انا زیادہ ہے

خموش رہنا ہی بہتر ہے اس کے آگے کمالؔ
جو جانتا ہے کہ وہ جانتا زیادہ ہے

سچ ہے کہ مجھ کو اس سے محبت نہیں رہی
اس کے خلوص میں بھی تو شدّت نہیں رہی

جھوٹی ستائشوں پہ سبھی خوش تھے اس قدر
سچ بولنے کی اب مری عادت نہیں رہی

تاریکیاں بڑھیں تو مجھے سوجھنے لگا
پھر اس کے بعد آنکھوں کی حاجت نہیں رہی

اب اس سے روز فون پہ کرتا ہوں گفتگو
کیفے میں جا کے ملنے کی فرصت نہیں رہی

لطفِ سفر ملے گا بھلا جنوری میں کیا
سورج میں جون جیسی تمازت نہیں رہی

اب کے زمانِ ہجر بڑا مختصر رہا
اب کے وصالِ یار میں لذّت نہیں رہی

سطحی غزل بھی ہو تو ترنّم سے پڑھ کمالؔ
اب شاعری میں فن کی ضرورت نہیں رہی

میں سنگ ہوں کہ گہر ہوں چلے پتا مجھ کو
اُٹھا کے رکھ لے کہ رستے سے دے ہٹا مجھ کو

زیادہ روشنی ہوتی ہے چاند میں لیکن
بہت عزیز ہے ننھا سا ہر دیا مجھ کو

سکون و چین سے رہنے کہیں نہیں دیتی
تمہاری یادوں کی یہ تیز تر ہوا مجھ کو

قدم قدم مرا واقف ہے میری منزل سے
تری طرف لئے جاتا ہے راستا مجھ کو

حیات اپنی غزل کی طرح حسیں ہوگی
ردیف بن کے بنا لینا قافیہ مجھ کو

قسم خدا کی میں اس کا غلام ہو جاتا
خلوص سے وہ اگر مجھ سے مانگتا مجھ کو

امیرِ شہر کی دعوت قبول کیسے کروں
کہ روکتی ہے وہاں جانے سے انا مجھ کو

کسی کے واسطے یہ زندگی غزل ہوگی
مری حیات تو لگتی ہے مرثیہ مجھ کو

ان سے اگرچہ پیش دلائل نہ ہو سکے
پھر بھی وہ میری بات کے قائل نہ ہو سکے

پتھر ہماری سمت چلے ہیں بہت ، مگر
روئی صفت ہیں ہم کبھی گھائل نہ ہو سکے

جب چل پڑے تو چلتے رہے سیل کی طرح
پربت ہماری راہ میں حائل نہ ہو سکے

اپنی نظر رہی ہے سدا سے ہی تہہ نشیں
ہم ظاہری اداؤں پہ مائل نہ ہو سکے

دانائیوں پہ اپنی خرد کو بہت تھا ناز
پر اس سے حل جنوں کے مسائل نہ ہو سکے

غم ہائے زندگی سے ہوئے اتنے سخت جان
تیرِ نظر سے ہم کبھی گھائل نہ ہو سکے

فاقہ کشی نے مارا تو ہم مر گئے ضرور
لیکن درِ امیر کے سائل نہ ہو سکے

جتنے ہمارے دل میں تھے ارمان اے کمالؔ!
اتنے ہمارے پاس وسائل نہ ہو سکے

سلامت کوئی بھی نہ ڈالی رہی
رہی جو وہ پھولوں سے خالی رہی

ہمیشہ گماں دل پہ غالب رہا
سدا زندگی احتمالی رہی

کبھی مانگے آنکھیں کبھی میرے خواب
یہ دنیا ہمیشہ سوالی رہی

چڑھاوا چڑھایا گیا ہے مرا
مری ذات پوجا کی تھالی رہی

نہ ہو پائی شاداب دل کی زمیں
یہاں سالوں بھر خشک سالی رہی

کبھی گزری مدّت تری یاد میں
کبھی مدّتوں بے خیالی رہی

منایا گیا اب کے جشن اس طرح
مکاں جل رہے تھے ، دِوالی رہی

کہیں قمقمے تھے کہیں چاند تھا
مری رات کالی تھی کالی رہی

کبھی دل میں ٹیسیں اُٹھائے خموشی
کبھی ایسا ہے دل کو بھائے خموشی

کبھی کچھ نہ کہہ کر بھی کہتی ہے سب کچھ
پسند آتی ہے یہ ادائے خموشی

ہر اک لفظ بے معنی لگنے لگے گا
کبھی غور سے سُن صدائے خموشی

خموشی بہت خوب صورت ہے لیکن
ترے لب پہ ہو تو نہ بھائے خموشی

بھری بزم میں یوں نہ خاموش بیٹھو
فسانہ کہیں بن نہ جائے خموشی

ستم گر ! بلا خوف مشقِ ستم کر
ستم سہہ کے سب چُپ ہیں، ہائے خموشی

یہ ہے بے حسی، مصلحت ہے کہ ڈر ہے
بتا ! کیا ہے آخر بِنائے خموشی

لبوں پر تبسّم بھی باقی نہیں ہے
المیہ ہے ، یہ انتہائے خموشی

آلامِ زندگی کا مزہ ہم سے پوچھئے
ہر دردِ مفلسی کا مزہ ہم سے پوچھئے

دل کے تمام زخم ہرے ہیں ابھی تلک
پھولوں کی تازگی کا مزہ ہم سے پوچھئے

رہبر کا ساتھ چھوڑ کے ہم چل پڑے الگ
دانستہ گمرہی کا مزہ ہم سے پوچھئے

ہر آدمی ہے مائل گفتار ان دنوں
ایسے میں خامشی کا مزہ ہم سے پوچھئے

ہر اک سے دوستی کی تمنّا بجا مگر
ہر اک سے دوستی کا مزہ ہم سے پوچھئے

صحرا میں رہ کے آپ ہیں پیاسے تو کیا عجب
دریا میں تشنگی کا مزہ ہم سے پوچھئے

حُسن و جمالِ یار پہ غزلیں تو خوب ہیں
پر تلخ شاعری کا مزہ ہم سے پوچھئے

تکمیلِ آرزو کی گذارش پہ اے کمالؔ
محبوب کی نفی کا مزہ ہم سے پوچھئے

کسی کو یاد میں ہر صبح و شام کرتا ہوں
وظیفہ پڑھتا ہوں پھر کوئی کام کرتا ہوں

سمجھ سکیں تو سمجھنے کی کیجئے کوشش
خموش رہ کے بھی میں کچھ کلام کرتا ہوں

فضول کاموں میں رکھتا ہوں خود کو اُلجھائے
تجھے بھُلانے کا یوں اہتمام کرتا ہوں

غمِ حیات کی بکھری ہیں فائلیں ہر سو
میں جی رہا ہوں کہ دفتر میں کام کرتا ہوں

میں حکمراں ہوں ہر اک دل ہے سلطنت میری
محبتوں سے میں سب کو غلام کرتا ہوں

سمجھ میں خود نہیں پاتا کہ کیوں کیا میں نے
کبھی کبھی کوئی ایسا بھی کام کرتا ہوں

جو آندھیوں میں بھی جلتے ہیں رہ گزر پہ کمالؔ
میں ان چراغوں کو جھک کر سلام کرتا ہوں

جب ستم گر کا ستم ڈھانے کو جی چاہے گا
شیشوں کا سنگ سے ٹکرانے کو جی چاہے گا

اس کی آنکھوں کے سمندر کی طرف مت دیکھو
تیرنے ، ڈوبنے ، بہہ جانے کو جی چاہے گا

پہلی بار اس سے ملا تھا تو یہ سوچا بھی نہ تھا
خوشی دے دینے کو ، غم پانے کو جی چاہے گا

چل پڑے ہو تو چلو ، چلتے رہو ، چلتے رہو
کہیں ٹھہرو گے تو سُستانے کو جی چاہے گا

غم کو دل میں کبھی تھوڑی سی بھی جا دو گے اگر
اُس کا پھر پاؤں بھی پھیلانے کو جی چاہے گا

میں نے یہ سوچ کے دروازہ کھلا رکھّا ہے
اس کا واپس مرے پاس آنے کو جی چاہے گا

کرب تنہائی گزر جائے گا جس دن حد سے
بیٹھے بیٹھے یونہی چلاّنے کو جی چاہے گا

اے کمالؔ اتنی بھی خوش فہمی نہیں ہے اچھی
میر و غالبؔ کبھی کہلانے کو جی چاہے گا

گھر میں رہنا ہے ، مسافر نہیں ہونا ہے مجھے
ظالمو! سُن لو ، مہاجر نہیں ہونا ہے مجھے

تیری مسند سے مجھے اپنی اَنا پیاری ہے
تیرے دربار میں حاضر نہیں ہونا ہے مجھے

خوش مجھے دیکھ نہیں سکتے ہیں دنیا والے
اور غمگیں تری خاطر نہیں ہونا ہے مجھے

میں صلہ اپنی وفاؤں کا نہیں مانگوں گا
میں تو دیوانہ ہوں ، تاجر نہیں ہونا ہے مجھے

ہوں جہاں سمت نما ، میل کے پتھر بھی ہوں
ایسے رستے کا مسافر نہیں ہونا ہے مجھے

دل میں رہنے دے، مجھے ہونٹوں پہ آنے مت دے
غمِ جاناں ہوں میں ، ظاہر نہیں ہونا ہے مجھے

مجھ کو تسلیم زمانے کا فریبِ پیہم
پر کسی طور بھی شاطر نہیں ہونا ہے مجھے

وصل اور ہجر کے قصّے جو بیاں کرتا ہے
اے کمالؔ ایسا تو شاعر نہیں ہونا ہے مجھے

حالِ دل مختصر کہا جائے
اس سے بہتر ہے چُپ رہا جائے

سنگِ بنیاد جب سرکتا ہے
اُونچا مینار بھی ڈھہا جائے

اک نیا زخم پھر ملا ہے ہمیں
اک نیا شعر پھر کہا جائے

تنہا تنہا بہت سہے ہم نے
کوئی غم مِل کے بھی سہا جائے

آگے رہزن ہے یا کوئی کھائی
رہنما پیچھے کیوں رہا جائے

دمِ رخصت ہنسی بھی ہے لب پر
اشک بھی آنکھوں سے بہا جائے

خون شریانوں سے نکل کے کمالؔ
گندے نالوں میں اب بہا جائے

ضرورتوں سے زیادہ بہت کماتا ہوں
مگر میں اپنے لئے کچھ نہیں بچاتا ہوں

یہ سوچ کر کہ پرندے بھی ہوں گے شاخوں پر
پھلوں کی سمت میں پتھر نہیں چلاتا ہوں

کبھی کبھی کسی الجھن میں ڈال کر خود کو
میں جان بوجھ کے یاروں کو آزماتا ہوں

اگرچہ دَور نہیں ہے مگر وفا کا چلن
بڑوں سے سیکھا تھا چھوٹوں کو اب سکھاتا ہوں

یہ طفلِ دل مجھے اکثر بہت ستاتا ہے
تھپک تھپک کے میں اکثر اسے سلاتا ہوں

کبھی کبھی تو یہ ٹیسیں مزہ بھی دیتی ہیں
میں دل کے زخموں پہ مرہم نہیں لگاتا ہوں

مری غزل کو ضرورت نہیں ترنّم کی
کبھی بھی شعر میں گا کر نہیں سناتا ہوں

بجھانے آئے ہیں وہ آگ میرے گھر کی کمالؔ
میں ان کو دیکھ کے دھیرے سے مُسکراتا ہوں

بہہ گیا گھر تو نہیں اس میں خطا بارش کی
مانگا کرتے تھے تمہی روز دعا بارش کی

وہ جو کاغذ کے مکانوں میں رہا کرتے ہیں
ان ہی کانوں میں آتی ہے صدا بارش کی

کبھی سیراب کرے پیاس بڑھائے وہ کبھی
سیکھ لی اس نے بھی اب ناز و ادا بارش کی

پوری بستی میں ہیں کھیت اس کے ہی شاداب فقط
وہ پرستش بھی تو کرتا ہے سدا بارش کی

تشنگی اپنی بجھانے کی پڑی تھی سب کو
کوئی بھی سُن نہ سکا آہ و بکا بارش کی

ہاں برس، اور برس اور برس اور برس
اے مری چشم تو اوقات بتا بارش کی

ریت کو دھوپ کا انعام دیا جاتا ہے
کھیت کو دیکھئے ملتی ہے سزا بارش کی

پتھروں پر کبھی اُگ سکتی نہیں گھاس کمالؔ
جون میں چل نہیں سکتی ہے ہوا بارش کی

در پر دیا جلا کے سر شام رکھ دیا
آنکھوں کو اپنی ہم نے لبِ بام رکھ دیا

آئی جب اُس کی یاد تو پھر کچھ نہ کر سکے
کل پر اُٹھا کے ہم نے ہر اک کام رکھ دیا

دشمن ہمارا شہر میں کوئی کہیں نہ تھا
ہم نے ہی اپنے قتل پہ انعام رکھ دیا

دوکان پر نقابوں کی ، اک بھیڑ لگ گئی
جب میں نے آئنے کو سرِ عام رکھ دیا

پھر یوں ہوا کہ تیرگی کچھ اس قدر بڑھی
لوگوں نے جگنو کا بھی قمر نام رکھ دیا

اہلِ خرد نے عشق کی ٹھانی تو تھی مگر
آغاز نے نگاہوں میں انجام رکھ دیا

اب راونوں کی گندی سیاست کا نام بھی
اندھی عقیدتوں نے شری رام رکھ دیا

دیکھا خمار ان کی نگاہوں میں جب کمالؔ
ہم نے شراب پھینک دی اور جام رکھ دیا

بک رہی ہے ہر اک دکان میں دھوپ
مول کر بھر لو جسم و جان میں دھوپ

دل کسی کا جھلس نہیں جائے
اتنی بھی رکھئے مت زبان میں دھوپ

جنوری میں لگان لیتا ہے
جون میں دیتا ہے وہ دان میں دھوپ

ہے گھٹا ٹوپ ہر یقیں تیرا
ہے کھلی میرے ہر گمان میں دھوپ

چڑھتا سورج بھی ڈوب جاتا ہے
کہتی رہتی ہے میرے کان میں دھوپ

زندگی کا عجیب موسم ہے
آنکھوں میں ابر ہے تو دھیان میں دھوپ

روک لی اُونچی بلڈنگوں نے کمالؔ
آ نہ پائی مرے مکان میں دھوپ

خیال مجھ کو یہ آیا ہے ایک ٹھوکر سے
دعائیں ماں کی لئے بن میں نکلا ہوں گھر سے

ستم بڑھے گا اگر چُپ رہیں گے سب ڈر سے
''جواب اینٹ کا دینا پڑے گا پتھر سے''

ہیں اہلِ حق جو سلامت تو رہتی دنیا تک
حسینی فوج لڑے گی یزیدی لشکر سے

میں سوچتا ہوں کہ دنیا کے جیسا ہو جاؤں
نہ جانے کون ہے جو روکتا ہے اندر سے

ہمارے زخموں سے پھولوں نے کھلنا سیکھا ہے
برسنا سیکھا ہے بادل نے دیدۂ تر سے

سیاسی لوگوں سے میری کبھی نہیں بنتی
مزاج شیشے کا ملتا نہیں ہے پتّھر سے

قلم کو تیغ بنانا بھی ایک فن ہے میاں
ہُنر یہ سیکھئے جا کر کسی سخنور سے

تخلّص اپنا کسی شعر میں نہ جوڑ کمالؔ
تری غزل کی ہے پہچان تیرے تیور سے

یہ سچ ہے اے زمیں کہ نہیں آسمان میں
اونچا ہوں پھر بھی تجھ سے کہ ہوں سائبان میں

حاصل تجھے عروج ہے میرے وجود سے
ترکش کا ایک تیر ہے تو اور کمان میں

دیوار و در نہیں مری بنیاد دیکھئے
اگلے زمانے کا ہوں پرانا مکان میں

شیشے پہ چوٹ مار کے پتھر نے یہ کہا
''اے دوست لے رہا تھا ترا امتحان میں''

تجھ سے تو میرا رتبہ کسی طرح کم نہیں
محفل کی جان تو ہے تو محفل کی شان میں

آ ، اے غمِ زمانہ ترا انتظار ہے
مہمان ہے تو ، دل ہے مکاں ، میزبان میں

طوفان آئے گا تو مری یاد آئے گی
اے مانجھی تیری کشتی کا ہوں بادبان میں

خونِ جگر سے سینچ کے میں شعر اُگاتا ہوں
لوگو ادب کے کھیت کا ہوں اک کسان میں

زباں سے تو نے صدا دی ہے بار بار مجھے
میں لوٹ آؤں گا دل سے کبھی پکار مجھے

مرے لہو کی ضرورت پڑے گی پھولوں کو
''چمن سے ڈھونڈنے آئے گی خود بہار مجھے''

مری وفاؤں کی قیمت لگاتی ہے دنیا
سکھاتی ہے یہ طوائف کا کاروبار مجھے

بہت زیادہ پکے پھل سڑے بھی ہوتے ہیں
بہت خلوص بھی کرتا ہے ہوشیار مجھے

نہ رہ سکے گا سلامت ترا سفید لباس
میں گیلی مٹّی ہوں پتّھر کبھی نہ مار مجھے

ہر ایک شخص ہے مصروف خود ستائی میں
دکھائی دیتا ہے ہر چہرہ اشتہار مجھے

خیال اس پہ، نظر در پہ، کان آہٹ پر
یوں بانٹ دیتا ہے خانوں میں انتظار مجھے

کمالؔ راہِ غزل میں ہیں لاکھوں نقشِ قدم
مگر ہے کرنی نئی راہ اختیار مجھے

کوئی بھی بات میری کب الگ ہے
مرے کہنے کا لیکن ڈھب الگ ہے

پلاتا ہوں جگر کا خون اس کو
غزل میری سبھوں سے تب الگ ہے

کسی کی ہو سکی ہے کب یہ دنیا
یہ وہ لڑکی ہے جس کی چھب الگ ہے

اُجالا چاند کا ہے خوب لیکن
چراغِ دل کی تاب و تب الگ ہے

عبادت ہے وظیفے پڑھتے رہنا
کسی کو یاد کرنا کب الگ ہے

خرد والوں کی محفل میں نہ پڑھئے
نصابِ عشق کا مکتب الگ ہے

میں ہوں دل کا صحیفہ پڑھنے والا
مرا مسلک ، مرا مذہب الگ ہے

وہ بڑھ گئے ، تھی نظر جن کی رہ گزر کی طرف
بھٹک رہے ہیں ، جو تکتے تھے راہبر کی طرف

بہت رسوخ و اثر آفتاب کا ہے مگر
ستارے کل بھی تھے ، ہیں آج بھی قمر کی طرف

سفر کے بعد سفر پھر سفر مقدّر ہے
نکل پڑا تو میں لوٹا کبھی نہ گھر کی طرف

ٹکی ہوئی ہے نظر سرو کی ترے قد پر
ہر ایک شاخ ہے تکتی تری کمر کی طرف

وہ جا چکا ہے مجھے چھوڑ کر ، زمانہ ہوا
نگاہ اُٹھتی ہے کیوں اب بھی رہ گزر کی طرف

یہ سنگ ریزے نہیں ہیں یہ پھول ہیں سارے
یقیں نہ ہو تو انہیں پھینکو میرے سر کی طرف

زمانہ آج اسی پر رواں دواں ہے کمالؔ
چلا تھا کل میں اکیلا ہی جس ڈگر کی طرف

ریگ زاروں میں نہیں آب تو کیا کیجے گا
ایسے ہی ہوتے ہیں احباب تو کیا کیجے گا

حاجتِ قطرہ ہو تو خواہشِ دریا نہ کریں
''بڑھ کے آجائے گا سیلاب تو کیا کیجے گا''

دوستی تلخ حقائق سے بھی کچھ رکھئے میاں
نہ رہے آنکھوں میں کل خواب تو کیا کیجے گا

خونِ دل بھر کے چراغوں کو جلائے رکھئے
کل اگر نکلا نہ مہتاب تو کیا کیجے گا

اپنے سوکھے ہوئے لب کی نہ نمائش کیجے
کوئی دے دے گا جو ہراب تو کیا کیجے گا

سیرِ ساحل کی کیا کرتے ہیں ہر روز جو آپ
کبھی للکارے گا گرداب تو کیا کیجے گا

سیکھ کے رکھئے کمالؔ آپ وفاؤں کا ہنر
ہوگا یہ دل کبھی بے تاب تو کیا کیجے گا

اِک خطا زندگی ، التجا زندگی
یہ مری زندگی بھی ہے کیا زندگی

رنگ ہے، روپ ہے، کوئی خوشبو نہیں
کاغذی پھول سی خوشنما زندگی

ہر کسی کی بھی ہے اور کسی کی نہیں
خوبصورت ، جواں ، فاحشہ زندگی

کاٹتا ہے جسے آج تک آدمی
جرمِ آدم کی ہے اک سزا زندگی

سانس لینے کو ہی زندگی مت کہو
ہے بہت کچھ بھی اس کے سوا زندگی

لوگ زندہ ہیں تعبیر کی آس میں
کچھ حسیں خوابوں کا سلسلہ زندگی

ہوش والو کبھی اس طرح بھی جیو
جیتا ہے جس طرح سر پھرا زندگی

ہم سفر بن کے چلتی رہی ہے مگر
بن نہ پائی کبھی ہم نوا زندگی

دن کو ہماری بنتی نہیں شیخ جی کے ساتھ
پر جھومتے ہیں رات کو ہم دونوں پی کے ساتھ

ہم پر زمانہ کرتا رہا نکتہ چینیاں
ہم اپنا کام کرتے رہے خامشی کے ساتھ

جیتے رہے ہو تم بھی اکیلے مری طرح
کچھ روز آؤ دیکھ لیں ہم دونوں جی کے ساتھ

کھودیں گے گر پہاڑ تو نکلے گی چوہیا
''امید باندھئے نہ بڑے آدمی کے ساتھ''

غالبؔ کی طرح بن کے نکمّا نہ بیٹھئے
صحرا نوردی کیجئے تیشہ زنی کے ساتھ

کاٹے گا پھر گلا مگر اب کے فریب سے
شمرِ لعین بیٹھا ہے ابنِ علی کے ساتھ

قدریں بدل گئی ہیں زمانہ بدل گیا
اب آزری بھی سیکھئے شیشہ گری کے ساتھ

سمجھو اسی کا نام سیاست ہے اے کمالؔ
ہو دوستی گدھے کی اگر لومڑی کے ساتھ

چاہے قلم ہوں ہاتھ ، کٹے سر ، غزل کہو
تم بے دھڑک خلافِ ستم گر غزل کہو

تم کامیاب ہو نہ سکو اور بات ہے
کوشش کرو کہ میر سے بہتر غزل کہو

کھڑکی میں ایک چاند ہے ، اک چاند عرش پر
دونوں کو دیکھو ، بیٹھ کے چھت پر غزل کہو

کربِ فراقِ یار سے راحت ملے گی کچھ
اختر شماری مت کرو شب بھر غزل کہو

لہجے میں تیز دھار ہو خنجر مگر نہ ہو
زخموں پہ جیسے چلتا ہے نشتر ، غزل کہو

لالی لبوں کی اور ہے ، لالی لہو کی اور
اِس پر غزل کہو ، کبھی اُس پر غزل کہو

اف یہ ہجومِ شعر ، ہجومِ سخنوراں
تاروں کے بیچ ماہِ منوّر غزل کہو

نقّاد چاہے جیسا لکھے نقد اے کمالؔ
خونِ جگر ملا کے سدا ہر غزل کہو

محبّت میں کوئی خط مختصر اچھّا نہیں لگتا
لفافے میں فقط تتلی کا پَر اچھّا نہیں لگتا

تم اپنے دل کے کمرے میں مجھے کیوں قید کرتے ہو
مسافر ہوں ، مسافر کو تو گھر اچھّا نہیں لگتا

میں چڑھ کر خود درختوں پر پھلوں کو توڑ لیتا ہوں
پرندے جو گرائیں وہ ثمر اچھّا نہیں لگتا

دِوانوں کو درِ مقتل کہیں آواز دیتا ہے
مجھے اب اپنے شانوں پر یہ سَر اچھّا نہیں لگتا

مہک جس میں نہ ہو باقی وہ گل گلدان میں کیوں ہو
نہ اٹھّے ٹیس تو زخمِ جگر اچھّا نہیں لگتا

تمہارے ہجر میں میرا عجب یہ حال ہوتا ہے
اِدھر اچھّا نہیں لگتا ، اُدھر اچھّا نہیں لگتا

نہ جس کے پھل میّسر ہوں نہ جس سے چھاؤں ملتی ہو
مجھے ایسا بہت اونچا شجر اچھّا نہیں لگتا

تقاضا مصلحت کا ہے خدا کہہ ناخدا کو بھی
اَنا یہ کہتی ہے ایسا نہ کر ، اچھّا نہیں لگتا

ادھر حسرت سے تکتے ہیں مکانوں کو سفر والے
ادھر دل میں سفر کی خواہشیں رکھتے ہیں گھر والے

بہت خوش ہیں بھری برسات میں سارے شجر والے
بہت غمگین بیٹھے ہیں مگر مٹّی کے گھر والے

کوئی لے کر گلاب آیا ، کوئی بیلا سمن لے کر
سبھوں پر لے گئے سبقت مگر زخمِ جگر والے

سحر ہوگی تو اپنی حیثیت پہچان جائیں گے
ابھی ہے رات تو اِترائیں گے ہی سب قمر والے

سفر کے لطف سے پہلے ہی منزل مل گئی ان کو
بہت پچھتا رہے ہیں دیکھئے سیدھی ڈگر والے

چراغِ راہ کو فانوس کی حاجت نہیں ہوتی
ہوا سے وہ ڈریں گے جو دیئے ہوتے ہیں گھر والے

قلم والوں نے ہی ان مسئلوں کے حل نکالے ہیں
جنہیں سلجھا نہیں پائے کبھی تیر و تبر والے

خرد سے کل ہوا تھا کچھ نہ اس سے آج کچھ ہوگا
جنونِ آبلہ پا سے جو کروانا ہے کروالے

دیواروں پہ چھت ڈھال کے گھر ڈھونڈ رہے ہیں
ہم اپنی ریاضت کا ثمر ڈھونڈ رہے ہیں

دیوانے نکل آئے ہیں منزل سے بھی آگے
دانا تو ابھی راہ گزر ڈھونڈ رہے ہیں

میں خوب سمجھتا ہوں یہ دریا کی ہے سازش
سیلاب اگر میرا ہی گھر ڈھونڈ رہے ہیں

پتوار لئے ہاتھوں میں ہم کشتی میں بیٹھے
دریا میں کہیں کوئی بھنور ڈھونڈ رہے ہیں

ناواقفِ آدابِ سفر ہیں وہ مسافر
آغازِ سفر میں جو شجر ڈھونڈ رہے ہیں

شانوں پہ جو خم ہیں وہ فقط کاسۂ سر ہیں
ہم تیغ لئے ہاتھوں میں سر ڈھونڈ رہے ہیں

آرام طلب ہیں وہ ، کمالؔ ان کو ذرا دیکھ
ساحل پہ کھڑے لعل و گہر ڈھونڈ رہے ہیں

دریچہ ہے نہ کوئی در ، بڑا عجیب سا ہے
میں جس میں رہتا ہوں وہ گھر بڑا عجیب سا ہے

وہ میرا حامی بھی ہے اور مرا مخالف بھی
جو شخص ہے مرے اندر ، بڑا عجیب سا ہے

مہینہ ہے نہ کوئی دن ، فقط ہیں تاریخیں
یہ زندگی کا کلنڈر بڑا عجیب سا ہے

تو قتل کرتا ہے ، دیتا ہے زندگی بھی مجھے
ستم یہ تیرا ، ستم گر! بڑا عجیب سا ہے

ہنسی لبوں پہ ہے ، آنکھیں ہیں ڈبڈبائی ہوئی
تری جدائی کا منظر بڑا عجیب سا ہے

ابھی چلا بھی نہیں اور دل پہ چوٹ لگی
تمہارے ہاتھ کا پتھر بڑا عجیب سا ہے

یہ تیری شاعری لگتی ہے ساحری مجھ کو
کمال! تو تو سخنور بڑا عجیب سا ہے

دوانہ جن کو ہیں کہتے عجیب ہوتے ہیں
کہ ایسے لوگ تو سب سے عجیب ہوتے ہیں

رتوں کے ساتھ بدلتے ہیں خال و خدان کے
سیاسی لوگوں کے چہرے عجیب ہوتے ہیں

جو جھلملاتے ہیں پلکوں پہ شام ہوتے ہی
وہ ننھے ننھے ستارے عجیب ہوتے ہیں

سفر طویل بھی ہو تو تھکن نہیں ہوتی
خیال و خواب کے رستے عجیب ہوتے ہیں

گزار دیتے ہیں عمریں بس ایک وعدے پر
کسی کو چاہنے والے عجیب ہوتے ہیں

سکھائے کوہ کنی اور بنائے صحرا نورد
محبتوں کے کرشمے عجیب ہوتے ہیں

جو دیکھنے میں تو لگتے ہیں آدمی کی طرح
وہ بستیوں کے درندے عجیب ہوتے ہیں

کمالؔ! سب سے الگ ہے تمہارا طرزِ سخن
غزل کے شعر تمہارے عجیب ہوتے ہیں

وہ ستم ڈھانے کے انداز بدل سکتا ہے
کوششیں کیجئے پتھر بھی پگھل سکتا ہے

سُست ہو چال مگر اپنے ہی پیروں سے چلو
لے کے بیساکھی تو اک لنگڑا بھی چل سکتا ہے

آج اس شخص سے مل کر مجھے اندازہ ہوا
اس زمانے میں کوئی کتنا بدل سکتا ہے

دل کے جذبات پہ موسم کا اثر ہوتا نہیں
یہ شجر وہ ہے جو پت جھڑ میں بھی پھل سکتا ہے

میں یہی سوچ کے مغموم رہا کرتا ہوں
میرا ہنسنا مرے احباب کو کھَل سکتا ہے

اپنے دل میں غمِ دنیا کو چھُپا رکھتا ہوں
ایک قطرہ بھی سمندر کو نگل سکتا ہے

دل کی تسکین کی خاطر کوئی وعدہ تو کرو
یہ بھی بچّہ ہے کھلونے سے بہل سکتا ہے

اپنی باتوں کو مختصر رکھو
اپنے لفظوں کو معتبر رکھو

میں ہواؤں میں اُڑنا چاہتا ہوں
میرے شانے پہ اپنا سر رکھو

غم کو دل میں، خوشی کو چہرے پر
جو جدھر کی ہے شَے ادھر رکھو

شبِ وعدہ کوئی چراغ نہیں
اپنی آنکھوں کو بام پر رکھو

تن کہیں، دل کہیں، دماغ کہیں
خود کو ایسے نہ منتشر رکھو

لمبے سائے پہ ناز کیا کرنا
اپنی نظروں میں دوپہر رکھو

تم کو تنہائی مار ڈالے گی
خود کو اتنا نہ خود نِگر رکھو

زندگی بعدِ مرگ بھی ہے کمالؔ
سر کو نیزے کی نوک پر رکھو

تمام رات رہا تھا میں بے قرار سا کچھ
بسا ہوا تھا نگاہوں میں انتظار سا کچھ

دعا ہے ماں کی ،شجر ہے یا ابر ہے کیا ہے
بچائے دھوپ سے مجھ کو ہے سایہ دار سا کچھ

میں جانتا ہوں وہ وعدے وفا نہیں کرتا
ہے میرے دل کو مگر پھر بھی اعتبار سا کچھ

یہ ماہتاب ہے ، یہ پھول ہے ، یہ جگنو ہے
چھپا ہوا ہے کہیں ان میں حسنِ یار سا کچھ

عجیب بات ہے جس نے دیئے ہیں غم مجھ کو
کبھی کبھی وہی لگتا ہے غم گسار سا کچھ

کسی کو دیکھ کے یہ دل بہت دھڑکتا ہے
کہیں ہوا تو نہیں مجھ کو پیار ویار سا کچھ

نہ جانے کون سا موسم ہے دل کے گلشن میں
دھواں دھواں سا کہیں ہے، کہیں غبار سا کچھ

نشے میں رہ کے بھی یادِ خدا میں رہتا ہے
گناہ گار بھی ہے کچھ کمالؔ پارسا کچھ

خون انساں کی ارزانی دیکھ جمورے دیکھ
پانی شرم سے پانی پانی دیکھ جمورے دیکھ

مکاں ہیں لیکن مکیں نہیں ہیں شہر ہوا سنسان
مذہب کی یہ کارستانی دیکھ جمورے دیکھ

کوئی شجر ہے نہ کوئی پرندہ صحرا بھی شرمائے
میرے دل کی یہ ویرانی دیکھ جمورے دیکھ

سب کچھ سہیئے ، کچھ مت کہیئے ، اور زندہ رہیئے
ہے حکم ظلِّ سبحانی دیکھ جمورے دیکھ

کوئی کمائے کوئی چرائے ڈاکہ ڈالے کوئی
مال و زر کی کھینچا تانی دیکھ جمورے دیکھ

زخم دل کے کھلے ہوئے ہیں رنگ برنگے پھول
بیلا ، جوہی ، رات کی رانی دیکھ جمورے دیکھ

اشک اُمڈ کر آ جاتے ہیں مانند سیلاب
آنکھ کا دریا ہے طوفانی دیکھ جمورے دیکھ

غم دنیا کے ، یار کی الفت ، میری خودداری
سب ہیں میرے دشمنِ جانی دیکھ جمورے دیکھ

دیکھتی ہے آنکھ سب کچھ اور زباں چپ چاپ ہے
مصلحت سے ہر کوئی اب تو یہاں چپ چاپ ہے

شور کرتی پھر رہی ہے اک خموشی ہر طرف
بند سارے در، دریچے، ہر مکاں چپ چاپ ہے

مجھ پہ اب کھلنے لگی ہیں موسموں کی سازشیں
جل رہا ہے گھر مرا، ابر رواں چپ چاپ ہے

اُٹھ رہی ہے ہر طرف سے اک صدائے انقلاب
ایسے میں اب کوئی گونگا بھی کہاں چپ چاپ ہے

ملنا جلنا ترک کر کے ہیں پشیماں دونوں اب
میں یہاں خاموش ہوں اور وہ وہاں چپ چاپ ہے

اب سفینہ ڈوب جائے گا یہ مجھ کو ہے یقیں
آج ساکت ہے سمندر، بادباں چپ چاپ ہے

ریگ زاروں کا سفر ہے، العطش کی ہے صدا
یا الٰہی! خیر، میرِ کارواں چپ چاپ ہے

دونوں ہیں تیار مرنے مارنے پر اے کمالؔ!
تیسرا وہ جو ہے ان کے درمیاں چپ چاپ ہے

تو رکھ دے ہاتھ مرے ہاتھ پر، ضروری ہے
سفر کے واسطے اِک ہم سفر ضروری ہے

سب اپنے سائے کو کہنے لگے ہیں قد اپنا
اے آفتاب یہاں دوپہر ضروری ہے

جو ظلم سہتا ہے جینے کا حق نہیں رکھتا
تو ظلم سہہ کے بھی چُپ ہے تو مَر، ضروری ہے

تمہاری یاد سے غافل میں رہ نہیں سکتا
یہ وہ دعا ہے جو شام و سحر ضروری ہے

کسی سے ہاتھ مِلاؤ، کسی سے بات کرو
سیاسی دَور میں یہ بھی ہنر ضروری ہے

تم اپنے دل کے دریچوں کو کھول کر رکھّو
کہ گھر میں تازہ ہوا کا گزر ضروری ہے

ہے راہ زن سے بھی خطرہ زیادہ رہبر کا
اسی لئے تو اکیلے سفر ضروری ہے

کمالؔ، خوب ہے مذہب پہ گفتگو تیری
مگر کبھی تو عبادت بھی کر، ضروری ہے

اپنے اجداد کی املاک بچا کر رکھئے
ہو پرانی بھی تو پوشاک بچا کر رکھئے

دل شکستہ نہ کریں لاکھ امیدیں ٹوٹیں
کوزے بن جائیں گے بس چاک بچا کر رکھئے

سر قلم ہوتا ہے ہو جائے ، نہ دستار گرے
کچھ بھی ہو جائے مگر ناک بچا کر رکھئے

ظلم سہنا بھی تو ظالم کی مدد کرنا ہے
اتنا بھی کافی ہے ادراک بچا کر رکھئے

خون دل سارا پلائیں نہ غم دنیا کو
کچھ غم دل کی بھی خوراک بچا کر رکھئے

گرد اُڑتی ہے کدورت کی ، ہوس کی ہر سو
ہے زمیں دل کی بہت پاک ، بچا کر رکھئے

کرتے ہی رہئے کمالؔ آپ ہوائی فائر
دلِ دشمن پہ جمی دھاک بچا کر رکھئے

سر وہ ہمارا قلم کرتے ہیں
جرم کہ کیوں نہیں خم کرتے ہیں

ہم وہ ابر کے ٹکڑے ہیں جو
سورج کو مدھم کرتے ہیں

بھول نہیں پاتے ہیں تجھ کو
کوشش تو پیہم کرتے ہیں

ہم غیروں کے آنسوؤں سے
اپنی آنکھیں نم کرتے ہیں

گرد آلود ہیں سونے چاندی
اور پیتل چم چم کرتے ہیں

تم نے تو سو تیر چلائے
لو اک وار اب ہم کرتے ہیں

لوگ ہماری غزلیں پڑھ کر
اپنے اوپر دم کرتے ہیں

ہم اپنے شعروں میں کمالؔ
دل کا حال رقم کرتے ہیں

نیلے ، پیلے ، کالے پتھر
سب ہیں دیکھے بھالے پتھر

میرا کہنا مان لے مجنوں
تو بھی آج اُٹھا لے پتھر

ہم کو توڑ نہ پھوڑ سکو گے
ہم ہیں روئی کے گالے، پتھر!

آبلوں کی ہے آج نمائش
رستے میں بچھوا لے پتھر

شیشوں کا طوفان اُٹھا ہے
خود کو آج سنبھالے پتھر

اپنے سینوں میں رکھتے ہیں
پھولوں سے تن والے، پتھر

میرے نازک دل کا شیشہ
اب ہے تیرے حوالے پتھر

کوس رہے ہیں سارے شیشے
کتّے ، کمینے ، سالے پتھر

ڈرتا ہے باہر کا سانپ
ڈس لیتا ہے گھر کا سانپ

ہر دم ڈستا رہتا ہے
مجھ کو مرے اندر کا سانپ

قدموں سے لپٹا ہے مرے
لمبی راہ گزر کا سانپ

دیکھ عصائے موسیٰ سے
ہارا جادوگر کا سانپ

سامنے ہے اک شیر ببر
پیچھے ہے گز بھر کا سانپ

جب سے نیولا پال لیا
دیکھ کے مجھ کو سرکا سانپ

شَے ہے عجب افواہ، کمالؔ!
اُڑتا ہے بے پَر کا سانپ

کوئی یہ دل کو بتا رہا ہے
وہ چل چکا ہے وہ آ رہا ہے

میں زخم دل کا دکھا رہا ہوں
وہ زیرِ لب مُسکرا رہا ہے

تمہیں مبارک زمینِ ساحل
مجھے سمندر بلا رہا ہے

دیا سا کچھ کوئی میرے دل میں
جلا رہا ہے ، بجھا رہا ہے

ہر ایک دستِ طلب سے اوپر
ہمیشہ دستِ عطا رہا ہے

جدھر وہ جانے سے روکتا تھا
اُدھر سے خود ہی وہ آ رہا ہے

کمالؔ! اب تو ترا عدو بھی
تری غزل گنگنا رہا ہے

دیکھو ایسا مت سمجھو
مجھ کو پرایا مت سمجھو

اک دن دھوکہ کھاؤ گے
سب کو اپنا مت سمجھو

سانسیں تو سب لیتے ہیں
سب کو زندہ مت سمجھو

جو اکثر چپ رہتا ہے
اس کو گونگا مت سمجھو

آہ و گریہ زاری کو
غم کا مداوا مت سمجھو

آنکھوں سے جو ٹپکا ہے
اس کو قطرہ مت سمجھو

سمجھ چکے جو کافی ہے
اور زیادہ مت سمجھو

میں ہوں تمہارے ساتھ کمالؔ
خود کو اکیلا مت سمجھو

سب اس کے محکوم رہے ہیں
آگے پیچھے گھوم رہے ہیں

صدیوں سے ہوتا آیا ہے
بزدل ہی مظلوم رہے ہیں

نئے زمانے میں بھی حسینی
پانی سے محروم رہے ہیں

جس میں تھی تصویر تمہاری
ہم وہ البم چوم رہے ہیں

برسوں پہلے نظر سے پی تھی
آج تلک ہم جھوم رہے ہیں

بھول چکے ہیں فن ہنسنے کا
ہم برسوں مغموم رہے ہیں

آ کر دل میں کر دے اُجاگر
کچھ جذبے موہوم رہے ہیں

کچھ مر کر زندہ ہیں ، اور کچھ
جیتے جی مرحوم رہے ہیں

دریا ہوں میں ، ساکت مجھے رہنا نہیں آتا
وہ جھیل ہے اور جھیل کو بہنا نہیں آتا

دل میرا غموں سے نہ شکستہ کبھی ہوگا
پختہ کسی دیوار کو ڈھہنا نہیں آتا

اک دل ہے جو اک آگ میں جلتا ہے ہمیشہ
آنکھوں کو مگر دھوپ بھی سہنا نہیں آتا

سب داغ بدن کے نئے کپڑوں میں چھپے ہیں
کوئی کسی کے آگے برہنہ نہیں آتا

کہہ دو وہ مرے چہرے کی تحریر کو پڑھ لے
حال اپنا زباں سے مجھے کہنا نہیں آتا

ظالم! ترے ہر ظلم کی روداد لکھے گا
خاموش مرے خامہ کو رہنا نہیں آتا

شہرت کے لئے مشقِ سخن کر تو کمالؔ اور
سستے میں کبھی سونے کا گہنا نہیں آتا

تاریخ شاید اس کو نہیں یاد دیکھئے
جنّت بنا رہا ہے وہ شدّاد دیکھئے

اوپر سے ہر مکان نظر آتا ہے حسین
اہلِ نظر ہیں آپ تو بنیاد دیکھئے

احسان مند ہونے کی تلقین کر کے وہ
حق دے رہا ہے از رہِ امداد دیکھئے

منڈلا رہا ہے سر پہ پرندوں کا ایک غول
چھپ کر قفس میں بیٹھا ہے صیّاد دیکھئے

مدّت سے کوئی زخم کا تحفہ نہیں ملا
دل پر پڑی ہے کیسی یہ افتاد دیکھئے

کچھ لوگ اپنی ذات سے اپنی شناخت ہیں
ہر شخص کا نہ شجرۂ اجداد دیکھئے

خونِ جگر سے لکھی ہے میں نے غزل کمالؔ
کیا نقد اس پہ لکھتا ہے نقّاد دیکھئے

جب بھی آئے تنہائی
درد جگائے تنہائی

تیری یاد کی بارش میں
خوب نہائے تنہائی

ساون کی برساتوں میں
آگ لگائے تنہائی

کان نہیں دل پھٹتا ہے
جب چلّائے تنہائی

اس دنیا میں میرا نہیں
کوئی سوائے تنہائی

میں نے چنی ہے اپنے لئے
خود ہی سزائے تنہائی

جیسے جیسے بھیڑ بڑھے
بڑھتی جائے تنہائی

یاروں کو جب دوں آواز
تب مسکائے تنہائی

سامنے آئینہ ہے اور میں ہوں
یہ کس کا چہرہ ہے اور میں ہوں

شدّت کی اک پیاس ہے ہونٹوں پر
اک سوکھا دریا ہے اور میں ہوں

آنگن ہے، دالان ہے اور سب ہیں
گھر کا اک کونا ہے اور میں ہوں

کہہ بھی رہا ہوں سُن بھی رہا ہوں خود
بس میرا دکھڑا ہے اور میں ہوں

طوفانی موجوں میں کشتی ہے
یادوں کا ریلا ہے اور میں ہوں

چاروں طرف ہے اک گہری کھائی
اک اونچا ٹیلہ ہے اور میں ہوں

کتّے بھونک رہے ہیں گلیوں میں
رات کا سنّاٹا ہے اور میں ہوں

کب اس سے ناطہ ٹوٹے گا کمالؔ
یہ پاپی دنیا ہے اور میں ہوں

سارا جہاں یزید کے لشکر کے ساتھ ہے
لیکن خدا ابھی بھی بہتّر کے ساتھ ہے

بہروں کی ہے عدالت ، اندھوں کی ہے گواہی
حسرت سے تک رہی ہے اب میری بے گناہی
دنیائے عاشقی میں ہیں بے مثال دونوں
اک تیری کج ادائی ، اک میری کج کلاہی

کبھی نہ سنگ سے ہوگی مصالحت میری
کہ ملتی جُلتی ہے آئینے سے صفت میری
میں اس کا رام ہوں پھر بھی بھرت نہیں دیتا
مری کھڑاؤں ہی واپس نہ سلطنت میری

اس کی ٹھوکر نے سنبھلنے کا ہنر بخشا مجھے
اتنی اونچائی پہ میں اس کے گرانے سے اُٹھا

رہِ حیات میں رسّی پہ چلنا پڑتا ہے
قدم پھسلتے ہیں لیکن سنبھلنا پڑتا ہے
ہمیشہ پیڑ سے پھل خود گرا نہیں کرتے
کبھی پھلوں کے لئے کچھ اُچھلنا پڑتا ہے

محل میں آگ لگتی ہے تو بادل گھِر کے آتے ہیں
کسی کٹیا کے جلنے پر کہاں پانی برستا ہے

بُرے دنوں میں خدا سب کو یاد آتا ہے
ہرا ہو زخم تو سب دیکھ بھال کرتے ہیں
فریب کھا کے بھی کرتے ہیں ہم یقیں اُس پر
کمال نام ہے سو ہم کمال کرتے ہیں

اس کو دل کا حال سُنا کر دیکھیں گے
بھینس کے آگے بین بجا کر دیکھیں گے
دریا ہم سے یاری کا دم بھرتے ہیں
اک دن گھر کو آگ لگا کر دیکھیں گے

سورج کے شہر میں مجھے اک گھر دیا گیا
پتّھر کا فرش ، شیشے کا چھپّر دیا گیا

دریا میں ڈالتا نہیں اب کوئی نیکیاں
سب گھومتے ہیں میلے میں سَر پر لئے ہوئے

ڈولتا رہتا ہے دل اس میں سفینے کی طرح
عشق اڈے ہوئے دریا کا سفر لگتا ہے

آرے چلا رہے ہیں وہی آج دیکھئے
کل دھوپ میں جو پیڑ کے احسان مند تھے
مرجھا گئے ہیں پھر بھی ہیں گل دان میں پڑے
وہ پھول جو تجھے کبھی بے حد پسند تھے

کبھی دانستہ کوئی چیز عاقل ہار جاتا ہے
سمندر جیتتا ہے وہ جو ساحل ہار جاتا ہے
اسیرِ عقل ہیں جو لوگ وہ کیا خاک سمجھیں گے
کسی کی اک ادا پر کیوں کوئی دل ہار جاتا ہے
زمینِ کربلا سے آج بھی آواز آتی ہے
بظاہر جیت کر بھی جنگ باطل ہار جاتا ہے

مسلسل چلتے چلتے چلنے والا ہار جاتا ہے
سفر پر میں نکلتا ہوں تو رستہ ہار جاتا ہے
سفینہ لے کے ہم جس دم اتر جاتے ہیں دریا میں
ہمیں آواز دے دے کے کنارہ ہار جاتا ہے

سونے کے پھول دان میں کاغذ کے پھول ہیں
ہر کھوکھلے بدن پہ چمکتا لباس ہے

دنیا سجی سجائی ہے بازار کی طرح
تکتا ہوں میں غریب خریدار کی طرح

نہ منزل کی تمنّا رکھ سفر میں
کھڑی رستے میں اِک دیوار مت کر

جب بھی کوئی خواہش ہونے لگتی ہے
دل پر عقل کی بندش ہونے لگتی ہے

اس کے آگے جو رو رہا ہوں میں
ایک پتھر بھگو رہا ہوں میں
جاگتا ہے وہ میری آنکھوں سے
اس کی آنکھوں سے سو رہا ہوں میں
فخر ہے مجھ کو اس حماقت پر
گھاس پتھر پہ بو رہا ہوں میں

اک تبسّم کے لئے کوئی مرا جاتا ہے
تھوڑا ہنس دے ترا ہنس دینے میں کیا جاتا ہے

رستہ بنانے اب کوئی موسیٰ نہ آئے گا
تختوں کو جوڑ جوڑ کے کشتی بنایئے

تبصرے کرتا ہے گرداب و تلاطم پر وہ
جس نے کشتی کو کنارے سے لگا رکھا ہے

یقین کر کے سبھوں نے دیئے بجھا ڈالے
کہا گیا تھا کہ سورج نکلنے والا ہے
ہے جادوگر یہ زمانہ ، نیا نیا دے کر
ہر اک چراغ پرانا بدلنے والا ہے

یہ عجب طرفہ تماشہ ہے کہ کاغذ کے بدن
آگ کے خوف سے تالاب لئے پھرتے ہیں

اردو زبان وادب کو
دنیا کے گوشے گوشے میں پہونچایئے
یہ کتاب
کسی دوست کو ای میل کیجئے

اردو دوست لائبریری

اردو دوست ڈاٹ کام

اس قسم کے بڑی فائلیں کسی کو بھیجنے کا آسان طریقہ
www.ifrendz.com/upload
بڑی سے بڑی فائل بھیجئے۔۔۔منٹوں میں
بھیجنے والا بھی خوش۔۔۔۔پانے والا بھی خوش